مقالاتِ اُردو

مرتبۂ

انجمن اردوئے معلّٰی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبع ہوئے ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء

تعارف

ان مقالات کی اشاعت کا اولین مقصد یہ ہی کہ ہندوستان کے سنجیدہ اصحاب فکر زبان کے مسئلہ میں ہندو مسلمانوں
یں تو ہندوستانیوں کی صحیح رہبری کرسکیں۔ اس وقت جو ذہنی انتشار رونما ہی اس کا صحیح حل اس وقت تک ناممکن ہی
تک ان تمام عناصر میں اعتدال نہ پیدا کیا جائے گا جن سے اس ملک کی تاریخ اور تمدن کا تار و پود وابستہ ہے۔ ان
ات کے مطالعہ کے بعد ہم میں سے کسی شخص کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوسکتا کہ اردو ہندوستان کی بے شمار اور متضاد
وں کا ایک متوازن مفاہمہ ہی۔

اس میں شک نہیں اردو کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے ہوئی لیکن اس میں مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔
ستان کی جغرافیائی تقسیم اور تمدنی اختلافات ایسی ہی زبان کے متقاضی تھے مسلمانوں کی آمد نے ہندوستان کو سب
یہ محسوس کرایا کہ طبعی اور تمدنی اختلافات کو ہموار کرنے اور رکھنے کے لئے مشترک زبان کا ہونا ناگزیر ہی۔ چنانچہ
د کا معرض وجود میں آنا نہ آنا نہ مسلمانوں کے بس کا تھا اور نہ ہندوؤں کے۔ یہ ملک کے مخصوص اور ناگزیر
ت و حوادث کا مطالبہ تھا جس نے زبان کے اعتبار سے اردو کا پیکر اختیار کیا۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی تھی لیکن فارسی کو اردو کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ اس لئے
دو ان نئے افکار ذہنی اور میلانات لسانی کی حامل اور متقاضی تھی جو قدیم افکار اور روایات پر رفتہ رفتہ
اصل کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں کسی ایسی زبان کا معرض وجود میں آنا لازمی تھا جو اردو کی مانند ہوتی یا جس کی
ہیں ہندوستان کے اس عہد کے مختلف میلانات پر سرِکار ہوتے یہ قطعاً اور بات ہی کہ ہندوستان کے لئے مشترک
کا مسئلہ اس وقت اہم بنا جب مسلمان برسرِکار تھے۔ بذاتہ میں تو یہاں تک ماننے کے لئے تیار ہوں کہ اگر گزشتہ
یں اردو عالمِ وجود میں نہ آئی ہوتی تو آج آتی اور آج اس کی حریف ہندی نہیں بلکہ انگریزی ہوتی !

ہندوستان میں غالباً اتنی اقوام آباد نہیں ہیں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کے لئے ایک مشترک

زبان ضروری سمجھتے ہیں تو سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ ان بے شمار زبانوں میں سے کون سی زبان اختیار کی جائے اس کے بعد یہ دقت پیش آئے گی کہ جس زبان کو ہم مشترک زبان کی حیثیت سے اختیار کر رہے ہیں وہ خود ہندوستان کے کن کن حصّوں میں عام یا مقبول ہے۔ مسئلہ کا یہ پہلو اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ دوسری طرف اگر ہم اُردو کو مدّنظر رکھیں تو یہی پہلو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ مزید کدوکاوش کی ضرورت نہیں رہتی۔

کسی زبان کو مشترک زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے میں انصافاً ہم کو یہ امر بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ کون سی زبان ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ہمسایہ ملکوں کی زبان سے کہاں تک ہم آہنگ اور متجانس ہے اور کس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم اُردو کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

" ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے ہیں تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا وہ اُردو ہے۔ اس کے ایک سمت کابل و بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمراں ہے اور دوسری طرف سواحل عرب و افریقہ سے لے کر جبرالٹرا تک عربی پھیلی ہے۔ ان تمام بیرونی قوموں کے لئے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اُردو ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ زبان ان تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے جہاں ہندوستانیوں کی آمد و رفت ہے۔ برما، سیلون، مالدیپ، انڈمان، مارشیس، سنگاپور، پورٹ بلیرا ور افریقہ کے ان مختلف ملکوں میں جہاں جا کر ہندوستانی بسے ہیں اس زبان کو اپنے سینوں سے لگا کر ساتھ لے گئے ہیں اور سواحل عرب میں عدن، جدّہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحوں اور مصر کے بازاروں تک میں اس کے بولنے والے ملے ہیں ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ادھر عربی درسگاہوں اور مسافروں اور تاجروں کے ذریعہ یہ زبان یاغستان، افغانستان، بخارا بلکہ چین کا شغر تک اپنا سلسلہ ملا چکی ہے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہندوستان میں پشاور سے کسی ریل پر بیٹھ کر آپ ہندوستان کے جس گوشہ میں بھی جائیں قلی اہل اسٹیشن، خوانچہ فروش، مسافر صاف صحیح نہ سہی تو جو ٹوٹی پھوٹی زبان وہ بولتے چالتے اور سمجھتے آپ کو سنائی دیں گے وہ یہی زبان ہوگی۔ ہندوستان کے پورے طول و عرض میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں خواہ ان کی مادری زبان کچھ ہو اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے

"اور ان صوبوں میں اُردو کی تعلیم کے مکتب اور اسکول قائم ہیں اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔"

(ہندوستان میں ہندوستانی' از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۳۲-۳۳)

کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُردو ہندوستان کی پیداوار ہے اور ایسی پیداوار جو بیرون ملک بھی مقبول ہے اگر 'ہندوستانی قومیت' کو مختلف اقوام ہند اور ان کی تاریخ، تمدن، اخلاق اور معتقدات کا ایک صحیح اور صالح نمونہ ہونا چاہیئے اور جس کے بغیر چارہ نہیں، تو پھر زبان کے معاملہ میں 'ہندوستانی زبان' کی ضرورت کیوں نہیں تسلیم کی جاتی لیکن اس کو کیا کیجیے ابنائے وطن میں ایسے بزرگ بھی ہیں جن میں سے ایک صاحب نے نہایت ذمہ دارانہ حیثیت سے ایک نہایت موقر صحبت میں علی الاعلان فرمایا کہ ہم ہندوستان کی مشترک زبان کا نام بھی ہندوستانی نہیں رکھنا چاہتے۔ اس لئے کہ اس لفظ میں عربی فارسی کی جھلک پائی جاتی ہے!

اس سلسلہ میں ایک دوسرا واقعہ بھی دلچسپ اور عبرت سے خالی نہیں ہے۔ اسی سال مسلم یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے راقم السطور کو دہلی میں ایک زبردست ہندی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا، مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا، پرشوتم داس ٹنڈن صاحب ایک مسئلہ پر تقریر کر رہے تھے، بحث اس پر ہو رہی تھی کہ کس صوبہ کی کون سی زبان ہے۔ دہلی کا نمبر آیا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ کانگرس نے دہلی کی زبان ہندوستانی قرار دی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ نے جو کانگرس کے علمبردار تھے نہایت وثوق سے فرمایا کہ زبان سے متعلق کانگرس رپورٹ کا مسودہ میں نے خود تیار کیا تھا؛ اس میں دہلی کی زبان ہندی قرار دی گئی ہے! ایک بزرگ نے میری ترکی ٹوپی پر ترس کھا کر فرمایا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا علی گڑھ یونیورسٹی سے۔ فرمایا وہاں آپ کیا ہیں؟ میں نے نہایت فخر کے ساتھ عرض کیا عربی کا پروفیسر ہوں!

ہندوستان کے لئے مشترک زبان لازمی ہے جو ہو کر رہے گی۔ ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زبان کو سارے ملک کی زبان تسلیم کرائے جانے کے لئے ہر قسم کی جائز کوشش کرے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہندو کہتے ہیں کہ ہندی ہونی چاہیئے، مسلمانوں کو اصرار ہے کہ اُردو ہو۔ دونوں اپنی اپنی بساط کے مطابق کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اُردو ہندی کا مسئلہ نفس زبان سے اتنا متعلق نہیں رہا ہے جتنا ہندو مسلم مذاہب سے۔

اور مذہب کا تصور آج ہم مذہب کی روح سے نہیں بلکہ مذہب کے پیرؤں سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں!

سر ولیم میرس نے ہندوستانی اکیڈمی یو پی کے افتتاح کے موقع پر اس سلسلہ میں ایک نہایت جامع اور معقول اصول یہ پیش کیا تھا کہ اُردو مصنفین کو یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ جس زبان میں اپنی تصانیف پیش کر رہے ہیں اُن سے ہندی داں طبقہ کو بھی بآسانی فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہو اور ہندی کے مصنف کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس کی تصانیف سے اُردو داں طبقہ بھی مستفید ہو گا۔ اس لئے دونوں کو حتی الوسع ایسے الفاظ اور عبارت کام میں لانی چاہیئے جس کو دونوں فریق آسانی سے سمجھ سکیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ان پر یہ الزام ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے خود بھی علٰحدہ ہو رہے ہیں اور اپنی تصانیف سے بھی ان کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی کا فرض ہے کہ وہ ہندی اور اُردو کو ایسا راستہ اختیار کرنے سے باز رکھے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندی یا اُردو صرف کسی خاص جماعت کی زبان ہے۔

اس سلسلہ میں اسی اکیڈمی کے اولین صدر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو جن کی قابلیت، تجربہ، روا داری اور شہرت و نیک نامی ہر طرح پر مسلّم ہے، اکیڈمی کے مشہور رسالہ (ہندوستانی جولائی نمبر ۱۹۳۴ء) میں یوں رقم طراز ہیں:

"جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں وہیں ایک زبان کا بھی مسئلہ ہے۔ اپنے دل کے بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اُردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اُردو اور ہندی کے لفظ ہندستانی استعمال کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ چالیس یا پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندستانی کا استعمال جائز ہوتا لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہے یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اُردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اُردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروّج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دیئے جائیں۔ پس میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اُردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندستانی کا لقب دے سکتے ہیں۔ مجھ کو تو اس کا خوف ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اُردو داں کو ہندی داں سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ہو گی اور اسی طرح

اس کا برعکس۔ اگر واقعی ہم لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس طریقہ سے اُردو اور ہندی کی علٰحدہ علٰحدہ ترقی ہو اور جو کچھ نتائج ہوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرأت کے ساتھ ہم اس کو مان لیں کہ اُردو دانوں کو اُردو کی ترقی کا استحقاق حاصل ہے اور ہندی دانوں کو ہندی کی ترقی کا۔ میرے خیال میں اگرچہ یہ بہتر ہوتا کہ ہندوستانی یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام طور پر ہندو اور مسلمان سمجھ جاتے رائج ہوتی لیکن اب اگر یہ ناممکن ہو گیا ہے تو ہم کم از کم یہ کر سکتے ہیں کہ غیر مانوس عربی اور فارسی کے الفاظ اُردو سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ ہندی سے خارج کرنے کی کوشش کریں . . . . "

یہ خیالات ایک ایسے شخص کے ہیں جس نے نہ صرف حالات اور واقعات کا گہرا اور صحیح مطالعہ کیا ہے بلکہ بڑی حد تک ملک اور قوم کے میلانات کی رہبری دل سوزی اور دانشمندی سے کی ہے اور ہندوستانی اکیڈمی کے صدر ہونے کی حیثیت سے اُردو اور ہندی کو متوازن اور ہم آہنگ رکھنے کی متواتر اور مسلسل کوشش کی ہے۔ سر سپرو کا پورا مضمون جس کا میں نے صرف ایک مختصر حصّہ یہاں پیش کیا ہے، اس قابل ہے کہ ہر اُس شخص کی نظر سے گزرے جو اُردو ہندی یا ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا صحیح اور غیر جانب دارانہ جائزہ لینا چاہتا ہے۔

اس اقتباس کے آخری جملہ کے معقول اور مناسب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج سے تیس چالیس سال قبل کی اُردو آج کی اُردو سے کہیں زیادہ عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں سے قریب تھی۔ دونوں عہد کی اُردو کا موازنہ کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ موجودہ اُردو، ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں سے بہت قریب آ گئی ہے۔ اور اس کامیابی کا سہرا سرسید اور اُن کے رفقا کے سر ہے۔ اُردو آج ہندی سے یوں مختلف یا غیر متجانس نظر آتی ہے کہ خود ہندی نے بجائے اُردو کی طرف بڑھنے کے سنسکرت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا سبب وہ قومی پاسداری یا عصبیت ہے جس کے نتائج کی طرف خود سر سپرو نے اشارہ کیا ہے، مثلاً :

" . . . آج کل یہ تماشا ہو رہا ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اُٹھ گئی ہیں۔ بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ عام جلسوں میں یہاں یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورد و نوش جائز رکھتے ہیں۔ مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو

معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے
لیکن چشم مروت رکھتے تھے۔ آپس میں دوستی اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ بے اعتمادی اُس
آزادی اور پولیٹیکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم سب دم بھرتے ہیں ... "

بذاتہ ہم کو اس امر کا اعتراف ہے کہ جہاں تک عام بول چال یا ایک دوسرے کی بات چیت سمجھنے کا تعلق ہے
اردو اور ہندی قریب قریب یکساں ہیں۔ اگر ہم تھوڑی سی احتیاط اور کوشش کریں تو بڑی حد تک ہماری تصانیف
اور متوسط طبقہ کی زبان بھی یکساں ہو سکتی ہے یعنی ایک ایسی زبان پیدا ہو سکتی ہے جس پر اُردو اور ہندی دونوں
(یعنی ہندوستانی) کا اطلاق ہو سکے۔ البتہ فرق ایسے مواقع پر ضرور پڑے گا جہاں ہم کو خالص علمی، ادبی اور سائنٹفک
مضامین کو اُردو یا ہندی کا جامہ پہنانا پڑے گا۔ لیکن یقیناً یہ دقت ایسی نہیں ہے جس پر ہم من حیث القوم ایک دوسرے کے
خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس قسم کی تصنیف کے لئے ہر فریق آزاد ہے کہ وہ جس قسم کی زبان مناسب سمجھے اختیار کرے۔

ہندو اور مسلمان جس طرح چاہیں ایک دوسرے کے وبال جان بنے رہیں لیکن ہندوستان اب الگ تھلگ
نہیں رہ سکتا۔ سیاسی، معاشرتی، لسانی، تمدنی، علمی غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خارجی انقلابات سے
متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہو۔ اس لئے عقل و دیانت کا یہی اقتضا ہے کہ ہم ہر اُس چیز کو قبول کرتے رہیں جو ہمارے ملک
اور قوم کے مستقبل کے لئے مفید ہو، جو ہم کو آگے بڑھائے اور ہمارے ولولوں کو افسردہ نہ کر دے۔ اس سلسلہ میں
سب سے زیادہ اہم فرض یونیورسٹیوں پر عائد ہوتا ہے جن کا اصلی مقصد حقیقت کو بے نقاب اور بروئے کار لانا ہے۔

۳۔ بذاتہ میری دلی تمنا ہے کہ ہر اہم دیسی زبان کی جداگانہ یونیورسٹی ہو جو ہماری خالص علمی، روحانی اور
اخلاقی بالیدگی کا مظہر بھی ہو گی اور محرک بھی۔ ہم کسی قوم کی حقیقی روح سے اُس وقت تک آشنا نہیں ہو سکتے جب تک
اُس قوم کے شعر و ادب کا براہ راست مطالعہ نہ کر سکیں۔

۴۔ ہندوستان مختلف قدیم اور مقتدر تمدنوں کا گہوارہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اس لئے یہاں دیسی یونیورسٹیوں
کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہندوستان پر ہمیشہ آسانی سے حکومت کی جا سکتی ہے لیکن کسی حکومت کو استقلال
اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی حکومت کا تار و پود، یہاں کے علم و ادب اور یہاں کے تمدن
اور روایات سے وابستہ نہ ہو۔ ہندوستان اکثر غیر اقوام کے قبضہ میں رہا لیکن قرائن یہ ہیں کہ اب اس کو خود

اپنے آپ پر حکومت کرنی پڑے گی۔ دوسروں پر حکومت کرنا آسان ہے، محکوم ہونا آسان تر ہے لیکن خود اپنے آپ اور اپنوں پر حکومت کرنا سب سے مشکل ہے۔ اپنی محدود بصیرت کی رو سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی صحیح اور صالح حکومت اُنھیں مقتضیات اور اُنھیں اصول کے ماتحت وجود میں آئے گی جن کی ماتحت اُردو وجود میں آئی۔

انجمن اُردوئے معلیٰ کی بنیاد مولانا حسرت موہانی نے رکھی تھی، اب ایک عرصہ سے ہم اس کے وابستۂ دامن ہیں۔

او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

انجمن کا مقصد اُردو شعر و ادب کا صحیح ذوق اور میلان پیدا کرانا ہے۔ کچھ پہلے انجمن کا سہ ماہی رسالہ سہیل شائع ہوتا تھا جس نے اپنے چند روزہ قیام میں کافی قبول عام حاصل کرلیا تھا، عن قریب یہ ازسرنو شائع ہوگا، طلبا اور اساتذہ کے علاوہ اکثر باہر کے حضرات بھی انجمن کو اپنے گرانبہا مقالات سے وقتاً فوقتاً مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال سید سلیمان ندوی صاحب قبلہ نے ایک مقالہ ہندوستان میں ہندوستانی انجمن کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا۔ دوسرا مقالہ "اُردو کیونکر پیدا ہوئی" ناگری پرچارنی سبھا کے لئے ممدوح نے مرتب فرمایا تھا، تیسرا مقالہ "اُردو پر اجمالی نظر" قبلہ محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس منعقدۂ لاہور میں پڑھا تھا۔ یہ تینوں مقالات صحت تحقیق، اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے اس قابل سمجھے گئے کہ ان کو ملک کے اصحاب ذوق و فکر کے سامنے پیش کیا جائے۔ پہلا اڈیشن ختم ہو رہا ہے۔ اس کے دوسرے اڈیشن میں بعض دیگر اہم اور مفید مضامین کا اضافہ کیا جائے گا۔ اُمید ہے کہ اس طور پر اُردو کے بارہ میں مستند اصحاب قلم کے مستند خیالات ملک و ملت کے سامنے پیش ہوتے رہیں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ علی گڑھ نے مسلمانوں کے افکار اور عمل میں زبردست اصلاحی انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس وقت ہم اُردو اور اس کے متعلقات کے سوا کسی اور بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں انھیں مقالات سے ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے جس کی صحت اور جامعیت کسی طور پر مشتبہ نہیں ہے۔

"...... علی گڑھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی میں بہت سی اولیات حاصل ہیں:

۱- یہ پہلا ادارہ ہے جس نے اس زبان کے لئے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا۔

۲- یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ میں اس کے مسلّم و مستند مصنف اور اہل قلم پیدا ہوئے۔

۳- یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور شائقین کے لئے فراہم کیا۔ علی گڑھ کالج بک ڈپو، آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

۴- اور سب سے آخر یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اور زباندانِ شہری اور قصباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا اور

جس طرح یہ زبان خود ایک مشترکہ زبان کی حقیقت کی مدعی ہے اسی طرح علی گڑھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزینہ دار بنایا اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعوؤں کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زباں دانی کا معیار قرار دیدیا اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی جس میں ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر شہر کے اہل قلم اور اہل علم برابر کے شریک ٹھیرے۔ سرسید دلّی کے تھے، محسن الملک اٹاوہ کے، مولانا حالؔی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی اعظم گڑھ کے۔ مگر ان سب کی تصنیفات نے مل کر اس زبان کا ایک متحد معیار مقرر کر دیا۔ سرسید مرحوم نے جس دن مولانا شبلی کے المامون پر یہ فقرے لکھے:

"یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف شُستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

تو درحقیقت اُنھوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خط فرمان لکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہل قلم کو زبان کھولنے کی جرأت اور اپنی اپنی بساط کے مطابق عرض متاع کی ہمت ہوئی اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی سامانوں اور ذخیروں سے مالامال ہونے لگا۔"

(ہندوستان میں ہندوستانی، از مولانا سید سلیمان ندوی صاحب)

ہم کو اندیشہ ہے کہ شاید ممدوح کے یہ خیالات بعض حلقوں میں مطبوع خاطر نہ ہوں لیکن ان کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ علی گڑھ کو کبھی دہلی، لکھنؤ، مرشدآباد، دکن یا پنجاب کے حریف بننے کا دعویٰ نہیں رہا اور نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے علی گڑھ کی تمام تر کامیابی اور کامرانی ان مقامات کے علاوہ ہندوستان کے ہر صوبہ، ہر شہر، قصبہ اور دیہات کے بہترین دل و دماغ کی بہترین افکار سے وابستہ رہی ہے، وہ ہر جگہ سے متمتع ہوا ہے اور اُس نے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس کی مثال سمندر کی ہے جس میں ہر جگہ سے پانی کے دھارے آکر مل جاتے ہیں اور جہاں سے ہر دھارے کی آبیاری ہوتی ہے۔

علی گڑھ جغرافیائی نہیں بلکہ ایک ذہنی تصور ہے۔ حریف بننے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ حلیف ہونا اس کا طرّۂ امتیاز ہے۔

مقالات اُردو مسلم یونیورسٹی کے بی اے (آنرس) اور ام اے کے اُردو امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ جب کوئی طالب علم ان جماعتوں میں داخل ہونا چاہتا ہے تو میرا پہلا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ مقالات کا مطالعہ کر کے آئے۔ اس کے بعد مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے، جہاں تک اُردو سیکھنے سکھانے کا تعلق ہے، کیونکر اور کس حد تک مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔

بذاتہ ان مقالات کا میں اتنا معترف نہ ہوتا تو ان کو ملک کے سامنے نہ پیش کرتا۔

رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اُردو و انجمن اُردوئے معلیٰ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان میں ہندوستانی

عزیزانِ گرامی! آج مدت کے بعد آپ کے سامنے اظہارِ خیال کا یہ موقع ہاتھ آیا ہے اس کے لئے آپ کے استاد محترم رشید صدیقی صاحب شکریہ کے مستحق یا شکایت کے مستوجب ہیں کہ انہوں نے مجھے کچھ کہنے اور آپ کو اس کے سننے پر مجبور کیا اگرچہ حضرت داعی کی طرف سے کسی مضمون کی تخصیص نہیں تھی لیکن "اردوئے معلیٰ" کی تقریب سے میں نے مناسب سمجھا اس مجلس کا موضوع "ہندوستان میں ہندوستانی" ہو اس زمانہ میں جبکہ ہر ملک میں یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہلِ ملک کے ہاتھوں میں دیدی جائے، یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایران میں ایرانی اور مصر میں مصری اور عراق میں عراقی کی طرح "ہندوستان میں ہندوستانی" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی صرف ہندوستانی ہوں لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ "ہندوستانی" سے میری مراد "ہندوستانی باشندے" نہیں "ہندوستانی بھاشا" ہے اور میری تقریر کا موضوع "سیاسی سوراج" نہیں بلکہ "زبانی سوراج" ہے آجکل بعض دوستوں نے "پنجاب میں اردو" اور "دکن میں اردو" لکھا ہے اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اردو" لکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ غریب "ہندوستان میں اردو" کی داستان بھی کچھ سنائی جائے، خدا کے فضل سے اس میدان میں صوبہ متحدہ، پنجاب اور دکن کے علمائے ادب نے جو تحقیقات کی ہے کہ "آبحیات" کا قصہ اب افسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

عزیزانِ اسلام! جس ملک میں ہم آپ آباد ہیں یہاں ہمارے اسلاف جن اغراض اور اسباب سے بھی آئے ہوں بہرحال اب ہم کو اسی دیس میں رہنا اور اسی زمین میں جینا اور مرنا ہے، آئیے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے اس پر غور کریں کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی۔

ہندوستان کو اسلام کے داخلہ سے جو علمی، تمدنی، تجارتی، صنعتی، تعمیری اور سیاسی فائدے پہونچے ان کو یہاں بیان کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع کے دائرہ کے اندر ہے، لیکن یہاں صرف ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بے شمار ملکوں اور ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے تھے، یہاں مسلمانوں کی آمد کا وہ زمانہ تھا جب اس ملک میں بودھ مت اور ویدک دھرم

ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لئے دست وگریباں تھے، وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے بودھ مت کی سیاسی طاقت کو توڑ کر ویدک دھرم کو ترقی دیکر پورے ملک میں ایک مذہب کو اکثریت کا موقع عنایت کیا،

ہندوستان جیسا کہ اس وقت کی تاریخوں سے ظاہر ہے سینکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں اور مملکتوں میں بٹا ہوا تھا، سلطان غزنوی کے فتوحات کے عہد میں اس ملک میں دو اسلامی اسماعیلی ریاستیں قائم تھیں، ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ (یعنی بھکر واقع سندھ) میں ان کے علاوہ صوبہ سرحد میں شاہی حکومت تھی جس کا پایہ تخت ویہند تھا، کشمیر، اجمیر، دہلی، قنوج، مگدھ (بہار) بنگال، گجرات، مالوہ، وغیرہ سینکڑوں ریاستیں تھیں، جو ایک دوسرے سے باہم دست وگریباں رہتی تھیں، مسلمانوں نے آکر ان ملکوں کو ایک ملک اور ان ریاستوں کو ایک سلطنت بنایا جس میں پشاور سے لیکر سورت تک ایک حکومت قائم تھی،

زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور ہیں چنانچہ پیمائش لسانی کے محققین اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروّج ہیں ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں کی صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو بھی یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی۔

مسلمانوں نے جب سے اس ملک میں قدم رکھا وہ یہاں کی زبانوں اور بولیوں کی کثرت کے شاکی نظر آ۔ ۲۷۰ھ میں جب کہ سندھ کی اسلامی عربی حکومت پر پونے دو سو برس گذر چکے تھے، منصورہ (بھکّر واقع سندھ) ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا، اور جو ہندوستان کی مختلف زبان سے واقف تھا، اور اس نے الرا (الورسند) راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی بولی) میں کیا تھا[۱]، مسعودی جو ۳۰۳ھ میں ہندوستان تھا، ہندوستان کی ملکی اور لسانی پریشان حالی کا تذکرہ ان لفظوں میں کرتا ہے۔

"بعد ازیں ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کرلی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج پر دوسرا، اور کشمیر میں تیسرا اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے گجرات کاٹھیاوار، بلہرا (دلبھ رائے) کی حکومت ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان ریاستوں میں باہم اختلاف ہیں[۲]"

---

[۱] عجائب الہند بزرگ بن شہریار صـ۳ پیرس۔ [۲] مروج الذہب مسعودی جلد اول صـ۱۶۲ پیرس۔

یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے:

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے ...... اور مانگیر (یعنی گجرات) کی زبان گیری ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لاری ہے۔"[1]

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے سندو ہند کی نسبت لکھتا ہے:

یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں والے ہیں اور ان کے لکھنے کے خط بھی کئی ہیں۔ ایک شخص نے جو اس ملک میں خوب گھوما پھرا تھا بتایا ہے کہ وہاں دو سو خط مستعمل ہیں؛[2]

یہ تو عربوں کے بیانات تھے اب فارسی والوں کے لیجئے: امیر خسرو نے جو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں تھے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں گنائی ہیں: سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (واقع بنگال)، گجراتی، تلنگی، معبری (کنڑی)، دھور سمندری (کارومنڈل) اودھی اور دہلوی،

امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی یہی بولیاں تھیں: ابوالفضل آئین اکبری میں ان زبانوں کے یہ نام گناتا ہے:

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شال، (جو سندھ کابل اور قندہار کے بیچ میں ہے)، بلوچستانی، کشمیری، یہ زبانیں آج بھی موجود اور بولی جاتی ہیں، صرف ایک بمبئی کے احاطہ میں گجراتی، ہٹی، کچھی، کنڑی، اردو، اور سندھی، چھ زبانیں رائج ہیں، مدراس میں اڑیا، تامل، تلنگو، ملیالم اور اردو پانچ زبانوں کا رواج ہے، ایک حیدرآباد کی ریاست میں مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگی اور اردو پانچ زبانیں ایک ساتھ ہیں، بہار اڑیسہ میں اڑیا، اردو، ہندی، ترہتی اور بھوجپوری بولیاں ہیں، پنجاب میں پنجابی اور اردو کا میل ہے اور صوبہ سرحد میں پشتو پنجابی اور اردو تین زبانیں دوش بدوش ہیں۔

ابھی حال میں ہمارا ہوا یا دھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیئے ہیں جن کو ہندوستانی اکاڈیمی نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے، فاضل موصوف نے اپنی دوسری

---

[1] مروج الذہب مسعودی جلد اول صفحہ ۳۸۱ پیرس۔ [2] کتاب الفہرست مصر صفحہ ۲۴

تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد بیاں کی پراکرت زبانوں کا کچھ کچھ حال بیان کیا ہے اور ان کی حسب ذیل چھ قسمیں بتائی ہیں، ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری پیشاچی، اونتک اور اپ بھرنش،

ماگدھی مگدھ اور اس کے قرب وجوار کے عوام کی زبان تھی، قدیم ماگدھی اشوک کے کتبوں میں ملتی ہے عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے ملازم مثلاً دھیور، سپاہی، بدیسی جین سادھو اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں،

شورسینی شورسین یا متھرا کے قرب وجوار کے علاقہ کی زبان تھی، سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی بات چیت میں اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے،

مہاراشٹری مہاراشٹر یعنی دیش کی زبان اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کے لئے کیا جاتا تھا،

پیشاچی پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی وشمالی حصوں کی زبان تھی،

اونتکا اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی، یہ زبان اجین اور مندسور میں رائج تھی،

اپ بھرنش اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ جنوبی پنجاب، راجپوتانہ اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا، دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے، راجپوتانہ، مالوہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ وغیرہ مقامات کے بھاٹوں کے ڈنگل بھاشا کے گیت اسی بھاشا کی بگڑی صورت میں ہیں، قدیم ہندی بھی بیشتر اسی بھاشا سے نکلی ہے،

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں،

ٹامل۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فائق ٹامل ہے اس زبان کا نشو ونما زیادہ تر جینیوں کے ہاتھوں ہوا، اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے،

ملیالم۔ ملیبار کی زبان ہے، مگر اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہیں،

کنڑی۔ اس زبان کے ادبیات کی پرورش وپرداخت بھی جینیوں نے کی،

تیلنگو۔ اندھرا صوبہ میں مروّج ہے،

تفصیل بالا ایک ہندو فاضل کی تصنیف سے ماخوذ ہے، ان حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں بیسیوں زبانیں مروّج تھیں جو زیادہ تر مختلف صوبوں مختلف قوموں اور مختلف دھرموں کے زیر سایہ اپنی ہستی برقرار رکھے ہوئی تھیں، مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور بھاشاؤں کی کثرت کو دیکھ کر متحیر رہ گئے، جیسے جیسے اُن کا قدم اندرونِ ملک میں آگے بڑھتا گیا اُن کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا، وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا سندھ کے حکمراں گو عرب تھے، مگر ایران کے قرب اور فارسی تاجروں اور جہاز رانوں کی آمد و رفت کے سبب سے عربی آمیز فارسی کی ہر جگہ کثرت تھی اور ادھر درّہ خیبر سے جو قومیں آئیں ان کی مادری زبان کچھ بھی ہو، مگر ان کی سلطنت کی شاہی اور دفتری زبان فارسی ہی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔

لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اُس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اُسی طرح اُس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

مذہبی اصطلاحات اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعاء، خیرات، صدقات، رسول، پیغمبر، وحی، کتاب الٰہی، دوزخ، بہشت، وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کا بعینہٖ ہندوستان کی ہر ملکی بولی میں وہ اضافہ پر مجبور ہوئے،

اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر عدل، صدر جہاں، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ سینکڑوں سیاسی اصطلاحات تھے، جو ان کی سلطنت کے روزمرہ میں جاری تھے، وہ ہندوستان کی ان مختلف ملکی بولیوں میں بھی جاری ہو گئے آج کل کی زمینداری میں خواہ وہ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی جس قدر عہدے اور مالی اصطلاحات ہیں وہ عموماً عربی فارسی آمیز ہیں مثلاً دیوان نائب، تحصیلدار، ضلعدار، کارندہ، گماشتہ، سیاہہ نویس، تحویلدار، واصلباقی نویس، خزانچی، متصدی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، محرر، ذخیرہ اب اصطلاحات کو لیجئے واصلباقی، جمع بندی، مالگذاری، جمع خرچ،

گوشوارہ، فرد، بند، روزنامچہ، یادداشت، خلاصہ کیفیت، جنسوار، پروانہ، تریج وغیرہ یہ الفاظ نہ صرف اردو اور سادہ ہندی میں بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں بھی بعینہٖ یا ان کے دوسرے مرادف مستعمل ہیں۔ مرہٹی بولنے والے مرہٹہ نے اپنے وزیروں کو پیشوا اور عام ہندوریاستیں ان کو آج تک دیوان کہتی ہیں اور یہ دونوں فارسی ہیں، اسی طرح مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں معاملہ مقدمہ کے بھی اکثر الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی ہیں، ہم اپنے صوبہ میں دیہاتی کسانوں کے سردار کو چودھری کہتے ہیں، لیکن مہاراشٹر یا اس کا نام مقدم ہے، کلرک کے لئے آپ محرر بولتے ہیں مگر وہ اس کو کارکن کہتے ہیں،

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا مسلمانوں نے آکر اس پیشہ کو فن کی حیثیت سے جو ترقی دی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مختصراً اتنا کہنا ہے کہ کابل ترکستان اور ایران کے بیسیوں میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے، اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی آئے اور یہ تمام ہندوستان کی ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں پر بعینہٖ چڑھ گئے، انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنگی، خربوزہ، تربزہ، سردہ، بادام، منقیٰ، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آلوبخارا، خوبانی، چلغوزہ، فندق، کے فرد سے اہل ہند ایسے مانوس ہوئے کہ ان پھلوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناموں سے بھی اپنی زبان کو نئی لذت بخشی پھولوں کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے مثلاً گلاب، سوسن، سنبل، ریحاں، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل طرہ، (گولٹہ ہیر) گل شبّو (گل شب بو) گل مخمل وغیرہ آج یہ واقعہ تعجب سے سنا جائے گا کہ تغلقوں کے زمانہ میں دہلی اور اس کے نواح میں بارہ سو باغ تھے جن میں نو قسم کے انگور تھے (تاریخ فیروزشاہی)

میووں کی تمہید سے مسلمانوں کے دسترخوان کے الوان نعمت یاد آئے، خشکہ، پلاؤ، قبولی، بریانی، زردہ، شیربرنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، یخنی، دم پخت، قیمہ، کوفتہ، مزعفر، مطنجن، حلوا وغیرہ مسلمانوں نے پیش کیا اور پورے ملک کے کام و دھن نے ان کے ناموں کا استقبال کیا ٹھنڈک کے لئے شربت، فالودہ اور برف کا آبخورہ سامنے رکھا، ہندوستان کی ایک روٹی کو کبھی نان بنایا کبھی شیرمال کبھی آبی، اور کبھی باقرخانی، اور کبھی روغنی اور کبھی چپاتی اور کبھی کاک اور کبھی کلچہ، مٹھائی ہندوستان کی چیز ہی، مگر صورت اور مادہ کے ساتھ ناموں کا تنوع اسلامی تہذیب نے بخشا، یہاں تک کہ مٹھائی بنانے والے کے لئے عربی نام حلوائی۔ مہابرہمن کی پاک اور پوتر زبان کو بھی مجبوراً چھولینا پڑا اور حلوائی کے "خوانچہ" پر بالوشاہی جس کی اصل شاید والاشاہی ہو قلاقند یا برفی، شکرپارے، نمک پارے، خرمے

نقل، گلاب جامن، حبشی، زعفرانی، وغیرہ ملیں گے،

کپڑوں کی نئی نئی صنعت کاریوں کی ایجادات کے ساتھ ان کے ناموں کو بھی ہندوستان کی زبانوں میں فروغ دیا، مخمل، قاقم، کاشانی، زربفت، طاس، مقیش، شروانی، مشجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری گلبدن، تن زیب، شال باف، جامہ وار، محمودی، علی قلی خانی، زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی، برہنہ تن ہندوستان کو ان کپڑوں کی بدولت کرتہ، اچکن، چپکن، پیشواز، میرزائی، نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوغا، فرغل، کلاہ، دستار، کلغی، شال، دوشالہ، چادر، پوستین، شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، مندیل، موزے، ازاربند، کمربند، کے نام عربی و فارسی اور ترکی سے آئے، پان ہندوستان کی چیز تھی، مگر اس کے لئے، پاندان، خاصدان اور اگالدان اسلامی تہذیب نے پیش کئے، کھانا کس ملک میں پکایا اور نہیں کھایا جاتا، مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کی ہانڈیوں اور کیلے کے پتوں سے آگے نہیں بڑھی، مسلمان آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، قاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں، اپنے ساتھ لائے، مسلمان جب یہاں آئے تو سرشام یہاں دیا اور دیک جلتا پایا، انہوں نے برسر محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی اور جابجا فانوس، دیوارگیر، لالہ، مردنگ اور فتیلہ سوز رکھے اور ان کے مشعل چی نے مشعل جلاکر راستہ کو پرنور کیا ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک تھا مگر شورہ لگا کر اور پہاڑوں سے برف منگا کر گرمی میں پانی کو ٹھنڈا مسلمانوں نے کیا اور حق، چلمن اور پردے لٹکا کر کمروں کو محفوظ کیا، اور ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو "خس" کہکر پکارا اور اس کی ٹٹیاں بنوا کر کھڑی کیں[1]۔

گھوڑے کی سواری کہاں نہ تھی مگر جب مسلمان یہاں آئے تو لگام، زین، تنگ، خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل، جس کی خرابی جھول ہے، سائیس، سوار، شہسوار، تازیانہ، قمچی، سب اپنے ساتھ لائے۔

جواہرات میں دُرِ عمانی، عقیق یمنی، لعل بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب، فیروزہ، سنگ ستارہ، سب ان کے لائے ہوئے ہیں، تعمیری پتھروں میں سنگِ مرمر، سنگِ موسیٰ، سنگ سرخ، سنگ سماق، سنگ لرزاں، سنگِ خارا سب ان کے نکالے ہوئے ہیں، زیوروں میں سرپیچ، مرزا بے پروا، کلغی، طرہ، کانوں میں دُرّہ، گوشوارے، ہاتھوں میں دست بند، جہانگیری

---

[1] اس کی تفصیلات بابر کی تزک میں ملیں گی،

بازوبند، نونگے، جوشن، پری بند، گلے میں ہیکل، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کمر میں کمرزیب، اور پاؤں میں پاؤزیب اُن بیسیوں ناموں کو چھوڑ کر جو ہندی میں وضع کئے یہ فارسی نام رکھے۔

خوشبوؤں میں عطر اُن کی ایجاد ہے، اور خود عطر اور اُس کے بیسیوں ہندی، فارسی اور عربی اُن کے وضع کردہ ہیں اور وہی ملک کی ہر زبان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۶ ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، سازوسامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لیکر یہاں وارد ہوئے، اور ان سب کے لئے نام و اصطلاحات و الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں اس لئے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی، اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے۔

۷ زبان کی ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے، اسم، فعل، اور حرف، مسلمانوں نے یہاں آکر جو زبان اختیار کی اُس کے تمام فعل اور حرف ہندوستان ہی کی بولیوں کے اختیار کئے، البتہ آدھے اسما جن میں بڑا حصہ نئی چیزوں اور نئے ناموں کا تھا، وہ اپنی زبان سے لائے، بقیہ اسما بھی ہندوستان ہی کے ہیں، ایسی حالت میں ہندو مسلمانوں کے مسلّمہ اصولِ تقسیم حقوق تہائی فیصدی سے زیادہ قبضہ تو مسلمانوں کا اس زبان پر نہیں، پھر کیا یہ ظلم نہیں کہ اس سے بھی دست بردار ہونے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے،

گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہونچتے ہیں، اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں، اس کا "ہیولی" اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندر ابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندروں سے گذر کر گجرات ہو کر بحرِ ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے، آخر پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا، یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتّب ہو کر آیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی و فارسی بولتے تھے، جہازرانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکّب تھی، خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی، خصوصاً جب ۱۳۲ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا، اور سندھ کے پنڈتوں نے بغداد جا کر اپنی زبان

سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصبوں پر سرفراز ہونے لگے اس زمانہ میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ ہے، پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے، جہاز کے نوا بگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے، اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) وغیرہ لفظ ہیں دواؤں میں سب سے عجیب نام مجھے "بہط" معلوم ہوتا ہے، جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا مفاتیح العلوم میں کیا ہے، جو ہمارے "بھات" کی خرابی ہے جو مریضوں کی غذا تجویز کی گئی تھی، پھلوں میں انبج (انب' آم) اور لیموں ہیں، جن کا ذکر ٣٠٣ھ میں مسعودی نے کیا ہے، سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں تین سو برس تک قائم رہیں اور آخر سلطان محمود المتوفی ٤٢١ھ کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا' ان ریاستوں کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان، عراق، یمن ایران اور مصر سے یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا ہے' اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولی' تیار ہو' خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، بزرگ بن شہریار ملاح جو ٣٠٠ھ میں بحر ہند کے سواحل سے گذرتا رہتا تھا' اُس نے اپنے بحری سفرنامہ میں جس کا نام عجائب الہند ہے کئی ہندی لفظ استعمال کئے ہیں وہ ٣٠٢ھ کا ایک قصہ ہم کو سناتا ہے جب الور واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے، منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اُس کو اُس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے' بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا' چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا' اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا۔ بغداد کا سیاح اصطخری ٣٤٠ھ میں سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا' وہ کہتا ہے:

"منصورہ (یعنی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے' اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے" (صفحہ، طبع لائیڈن) اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل جس کی سندھ اور ملتان میں سیاحت کا زمانہ ٣٥٠ھ ہے وہ بھی یہی کہتا ہے کہ

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے" (سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ لائیڈن)

اس کے چند سال کے بعد ۳۷۵ھ ۹۸۵ء میں بشاری مقدسی ملتان آیا، وہ لکھتا ہے،

"اور یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے" (سفرنامہ بشاری صفحہ ۴۸۱ لائیڈن)

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ واقع سندھ کے حال میں کہتا ہے۔

"دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا ہے، یہ سب سوداگر ہیں ان کی زبان سندھی اور عربی ہے (ایضاً صفحہ ۴۷۹)

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر یہ ماننا پڑیگا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لیکر بھکر اور ٹھٹھ کے سواحل تک پھیلی تھی اس زمانہ میں ایران ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا ہے، اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آکر ہندوستان کے جس پہلے شہر میں وہ داخل ہوتے تھے وہ ملتان تھا، چنانچہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے زمانہ تک جو سلطان التمش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز نقل ملتان سے لاہور گیا اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا،

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی، وہ سندھی اور ملتانی ہے، پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی، سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے، چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے، اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے، اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں، مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں،

سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے، تینوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے، صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے

جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اُردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو انھیں بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز انھیں بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنۃ دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنۃ کی بولی معیاری زبان بنکر تمام صوبوں میں پھیل گئی، علامہ بیرونی المتوفی ۴۴۲ھ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہکر کتاب الہند کا مسالہ مہیا کیا ہے، اُس نے اپنی اس کتاب میں جس لہجہ اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں اُن سے ماہرین ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں،

بہرحال اب وہ زمانہ ہے جب غزنین میں آل سبکتگین کی حکومت قائم ہے، اور سبکتگین اور اس کا نامور فرزند ہندوستان پر پے درپے حملے کرتے ہیں، ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی گو علمی و ادبی و سرکاری زبان فارسی تھی، سلطان محمود غزنوی المتوفی ۴۲۱ھ نے گو گجرات تک دھاوا کیا، مگر اُس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران، اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آکر بس گئے اور ہزاروں ہندوستانی اُن ملکوں میں جا پہنچے، اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی[1]، غزنویوں کی فوج میں بہت سے ہندو افسر اور سپاہی نوکر تھے اور وہ حدود سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے،

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا، جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں ہوئی تھی، اور صفہان جاکر اُس نے فارسی سیکھی تھی، سلطان مسعود کے زمانہ میں جو ۴۲۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا، اس عہدہ پر ایک ہندو بیربل نام سرفراز تھا سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے، فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے، کالنجر کے راجہ انندا نے ۴۱۳ھ میں ہندی میں بادشاہ کے لئے مدحیہ شعر لکھے،

"انندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آنرا بفضلائے
ہند و عرب و عجم کہ در ملازمتِ او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفرین کردند" (فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہلِ ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندوؤں کی زبانوں پر

---

[1] علاوہ تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ "بندہ خریدن"

فارسی الفاظ چڑھ جائیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض اُن شعرا کی زبانوں سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کا منہ تک بھی نہیں دیکھا تھا، حکیم سنائی غزنوی (۴۶۳ھ۔۵۴۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے وہ اپنے ایک قصیدہ میں زبانوں کے اختلاف کو غیر اہم بتا کر فرماتے ہیں،[1]

توبے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی　　　ز شکِ لغتہا سوئے ایمنی و آنی

اسامی درین عالم است ارنہ دانشا　　　چہ آب وچہ نان وچہ میدہ چہ پانی

عہدِ غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا، اس کی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا، اور اس زبان میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے:

برآمد ازپسِ دیوارِ حصن مارا مار[2]

ان شعروں میں پانی اور مارا مارا اور شاید میدہ[3] ہندی لفظ ہیں جو اہلِ ولایت کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے،

اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں غوریوں کا دور شروع ہوا، جنھوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھکر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا، ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہوگئی، اور اس پورے ملک میں جہاں کہیں بھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی ایک مشترک زبانِ ہند کا ہیولیٰ تیار ہوگیا، قاضی سراج منہاج جو ۶۲۴ھ میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"واین راز زبانِ دیگر است میاں لغت ہند و تبت" (صفحہ ۱۵۲ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لیکر بنگال تک پیدا ہوچکی تھی جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان کے بیچ میں تھی،

یہیں خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں:

---

[1] کلیات سنائی بمبئی صفحہ ۹۶ [2] بحوالہ "پنجاب میں اردو" [3] لفظ میدہ فارسی لغات میں گو ملتا ہے (مؤید الفضلا) مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے، کیونکہ یہاں شاعر نے آب و پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ہے ویسے ہی نان اور میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے بطور لف و نشر غیر مرتب،

"آب بنگبتی گویند چوں بدریائے ہندوستاں درآید او را بلغت ہندوی سمندر گویند" (صفحہ ۱۵۲ طبقات ناصری سراج منہاج کلکتہ)

دہلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ میں "لک بخش" کا خطاب دیا تھا (فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۶۳) "یعنی لاکھوں کا دینے والا" اس کے زمانہ کی تعریف میں اہل ہند "کال قطب الدین" کہتے تھے "وکال زمانہ را گویند" (فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۶۳ نولکشور) اس عہد کے سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ "سری امیرا" لکھا ملتا ہے، شری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں شری مہراج کی ترکیب میں مستعمل ہے، مگر اس وقت کی اس ترکیب "شری امیر" پر ذرا غور کیجئے،

شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش، لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو ۶۱۵ھ میں شکست دیکر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے لالیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آگئے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیان" کا لفظ اس زمانہ میں "سوداگران بارچہ" کے ہم معنی ہوگیا تھا[1] اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کی تخلیق و تکوین میں آکر مل گئیں اس کی سند میں ایک ایسی بزرگ ہستی کا نام لینا ہے جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت تو ملتان اور سندھ میں ہوئی، مگر روحانی اکتساب فیض دہلی میں فرمایا، اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ،

جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان میں غزنی اور غور کے سلاطین، ملکی فتوحات کے لئے جہاں جہاں بڑھتے تھے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے، اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنیں اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا، یہ ایک خود مستقل موضوع ہے اور کبھی فرصت سے یہ بڑی داستان بھی سننے کے لائق ہے،

ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو محسوس ہوتی تھی، اس سے کہیں زیادہ عوام

---

[1] دیکھو تاریخ فیروز شاہی،

کو اور ان سے زیادہ صوفیوں کو جو ہر بولی کے انسانوں تک پہونچنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب تک اردو کی تاریخ میں اکبر اور شاہجہاں اور ان کے مینا بازار اور اردوی معلیٰ کو اہمیت دی گئی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے کہیں زیادہ صوفیہ کو حاصل ہے جن کو ہندوستان کے عوام کی زبان کو اختیار کرنے میں نہ سلطنت کے رعب داب کا خیال مانع آسکتا تھا، اور نہ علم ظاہر کے جبہ و دستار کے وقار کا، بلکہ عوام کی اصلاح اور حق کی تبلیغ کی خاطر ان کو ہندوستان کے عوام کی دیسی زبان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہ تھا، ٹھیک جس طرح مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کے عوام کی زبان کو بودھ نے اپنے دھرم کے پرچار کے خاطر اختیار کیا، اور اسی میں اپنا اپدیش دیا، اور جس طرح مسلمانوں کے بعد عیسائی پادریوں اور مشنریوں نے یہاں کے عوام کی بولیوں کو بے تامل استعمال کیا، اسی طرح ان صوفیہ نے اس وقت کے عوام کی دیسی زبان کو بولنے میں پیش دستی کی،

اس وقت تک اردو کے جتنے قدیم فقرے مل سکتے ہیں، وہ عموماً صوفیوں کے ملفوظات ہیں، اور اردو کی پرانی تصنیفیں خواہ وہ دکھنی ہوں یا گجراتی، وہ سب صوفیوں کی لکھی ہیں، جس طرح ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے کچھ پہلے دلی کے علم و عرفان کے مشہور خانوادہ نے وقت کی اردو زبان کو جس کو اس وقت ہندی زبان کہتے تھے اپنے اصلاحی رسالوں اور تصنیفوں اور قرآن و احادیث کے ترجموں کے لئے فارسی کے بجائے پسند کیا، اور عوام تک پہونچنے کی خاطر اردو ہی کو جس میں اس وقت تک شمالی ہند میں لکھنا پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا بے تکلف قبول کیا، اور اصلاحِ دین اور ردِّ بدعات کا بڑا ذخیرہ اردو میں جمع کر دیا، جس نے رفتہ رفتہ اہل علم سے اس نئی زبان میں لکھنے پڑھنے کا حجاب اٹھا دیا،

خانوادۂ چشت کے فردِ فرید شکرستانِ معرفت کے مشہور گنجِ شکر سے کون واقف نہیں، حضرت خواجہ فرید گنج شکر کا خاندان اگرچہ کابل کا تھا مگر شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ملتان آکر بس گیا تھا، اور خواجہ کی ولادت نہیں قصبہ کھتی وال مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ میں ہوئی، خواجہ کا نشو و نما اور ان کی تعلیم و تربیت ملتان میں ہوئی، اٹھارہ برس کی عمر تھی، ملتان کی مدرسہ میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ میں کتاب نافع کا درس لے رہے تھے، کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا گزر ہوا، اور ایک ہی نظر کیمیا اثر نے ان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، بہرحال ملتان سے نکل کر قندھار اور دوسرے ممالک سے اخذ فیض کے بعد پھر اپنے وطن واپس آئے، اور بعد کو اپنے پیر کے

حضور میں دلّی آئے، اور یہاں سے پنجاب کے شہر اجودھن میں جا کر اقامت اختیار کی، اور وہیں ۶۶۴ھ میں آسودۂ خاک ہوئے[1]

اس وقت تک اس زبان کی ابتدائی تاریخ کا جہاں تک پتہ لگ سکا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیریں دہن جس کے منہ سے مصری کی یہ ڈلیاں پہلے نکلیں، خواجہ فرید گنج شکرؒ ہیں چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابوں میں سا موصوف کی چند فقرے ملتے ہیں:

۱۔ پہلا فقرہ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوہ کے درمیان ہوا، خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خورد سال بچہ برہان الدین کو ان کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا، اس پر ان کی والدہ نے کہا "خوجا برہان الدین بالا ہے" خواجہ نے فرمایا "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

یہ بالا وہی لفظ ہے جو لڑکے بالے اور بچہ بالا کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے،

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ میں عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے، خواجہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان کو ہندوستانی زبان میں ادا فرمایا، ہمارے کتبخانہ میں اردو تصوف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت کے یہ فقرے مذکور ہیں، فرمایا[2]:

۲۔ در راستا بگوئی "اوہی ہی" و در چپا بگوئی "یہی ہی" در دل بگوئی "اینہی ہی" دیگر بزبان ہندی،

۳۔ در راستا "ہہ تون" و در چپا "ہی تون" و در دل "ہہ تون"

۴۔ دیگر گویند از طرفِ دل "ہون تون" و طرفِ آسمان "تون" "تون ہوں" کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ انا انت کا ترجمہ ہے۔

تصوف کے اذکار کے ایک اور رسالہ میں جس کا نام "جواہر خمسہ" ہے اور جس کا ۹۰۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں ہے یہ مذکور ہے:

"بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس اللہ سرہٗ ذکر بزبان ہندی وضع فرمودہ اندر عمل آوردہ اند در بابے میں اند اہنوہنہ تون اہنوہنہ تون وہیں تون سوئے آسمان نگریستہ بزبان گوید اہوہنہ

---

[1] سیر الاولیاء بحوالہ پنجاب میں اردو [2] رسالہ شیخ بہاء الدین بن ابراہیم عطار القادری قلمی دار المصنفین۔

تُوں۔ . . . بازرو ی سوی زمین کردہ ہمان طریق این بزبان گویدا ہُو ہہ توں . . . . بعدہ نظر را

بردار دو بر خود گمارد یا پے سہ کرت یا ہفت کرت، اِہیں توں"

شیخ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے[1]، آپ سے پوچھا گیا کہ ذہن کا مقام کہاں ہے؟ تو فرمایا "بیچ سر کے"[2]

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے تھے ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے

سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا اگر آئی ہے "چرا بستہ اید"

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے کچھ لوگ ان کے راستہ میں چھپکر بیٹھ گئے جب

آپ کو یہ معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے، اور ہندی میں فرمایا "سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"[3]

ہمارے وطن (ولیسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتبخانہ ہے، اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ

ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں، اور ساتھ ہی ذیل کی ایک نظم بھی ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دران وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

با دمِ خود ہمدم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بوری بات ہے

با تن تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پندِ شکر گنج بدل و جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اُردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ میرے خیال میں

یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی ہے اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص

سمجھنا تعجب انگیز ہے ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے کو آپ شکر گنج نہیں کہتے تھے، اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبانِ مبارک

سے بعض ہندی دوہرے ادا ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم اور مستند وہ ہے جو میر خورد دہلوی نے سیر الاولیا میں

نقل کیا ہے۔

"ایں دوہرہ کہ بزبان مبارک حضرت شیخ الشیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است مناسب ایں معنی است،"

---

[1] تاریخ اُردوے قدیم بحوالۂ اسرار الاولیا صفحہ ۳، [2] ایضاً بحوالۂ جواہر فریدی صفحہ ۲۰ [3] "پنجاب میں اردو" بحوالۂ جواہر فریدی۔

گنت نہ تیں کا رری نا کان ست منائے
بس کند سے مدھن گر ہو ریں لیا ئے[1]

بہرحال اس نظم سے قطع نظر کرکے اوپر کے فقروں میں "کا" اور "کے" اضافت کی علامت "ہوتا ہے" اور "آئی ہے" فعل اور "ہوں" "توں" "اوہی" "یہی" ضمیر اور "ایہی" اور "ہوان" اور "بیچ" ظرف اور "بالا" "چاند" "آنکھ" "بھیا" اسما اس میں موجود ہیں،

خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیا رالمتوفی ۷۲۵ھ کے ملفوظات فوائد الفواد میں جس میں حضرت کے ۷۲۲ھ تک ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کئے ہیں حسب ذیل ہندی الفاظ ان کی زبان مبارک سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں پیاز (صفحہ ۹) لنگوٹہ (صفحہ ۹) کھٹ (یعنی کھاٹ صفحہ ۱۰) کندوری (دسترخوان صفحہ ۵۵) چھجہ (صفحہ ۶۰) لنگھن (فاقہ ۸۶) دھاڑی (یعنی ڈاکو صفحہ ۱۲۰) لت (صفحہ ۱۷۳) حضرت سلطان الاولیا کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے،

لنگھت گر کند ترا فربہ سیر خوردن نزا رلنگھن بہ

حضرت سلطان الاولیا، شیخ احمد نہروالی کے ذکر میں فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے "ہندویا خوش گفتے" و "ہندوی میگفت" یعنی ہندی گایا کرتے تھے جامع مسجد اجمیر کے امام فقیہہ یا دھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ ان کا ہندی گانا سنکر فرمایا چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندوی خرچ کنی" شیخ احمد نے اُسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کر دیا (صفحہ ۴۰، مطبع اودھ اخبار)

شیخ نظام الدین اولیا کے مرید شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی (المتوفی ۷۵۲ھ) نے جب اپنے ایک مرید شیخ اخی سراج کو بنگالہ رخصت کیا تو انہوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاء الدین قل سرفراز ہیں فرمایا "تم اوپر قل تلے"[3] شیخ نصیر الدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں جو ۸۱۵ھ میں دہلی سے بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آ گئے، اور یہیں ۸۲۵ھ میں وفات پائی اُن کا ایک فقرہ اُن کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے "جو کوں کھوے سول خدا کچھ ایرتیا ہے پو خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہوئے"[4] ان بزرگوں کے ان مسلسل فقروں کو سنکر اب اس میں شک کی کیا

---

[1] سیر الاولیا صفحہ ۳۰۳ [2] فوائد الفواد صفحہ ۸۰ [3] تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۰۸ نولکشور [4] تاریخ زبان اردو تدیم نولکشور صفحہ ۲ بحوالہ عشق نامہ عبداللہ بن عبدالرحمان چشتی،

گنجایش رہتی ہے کہ اس زبان کی عمر جتنی سمجھی جاتی ہے اُس سے کتنی زیادہ ہے، یہ حقیقت میں ہندوستان ہی کی زبان تھی جس کو ان بزرگوں نے قبول کی نظر سے دیکھا، اور محبت کی شکر میں گھولا'

یہ خلجی اور تغلق سلاطین کا دور ہے ان بادشاہوں کے زمانہ کی دو یادگار تاریخیں ہمارے سامنے ہیں، تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی، اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف' ان دونوں تاریخوں میں جن میں سے پہلی دہلی میں چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اور دوسری ساتویں صدی کے بیچ میں تصنیف ہوئی ہے' بہت سے ہندی الفاظ اور مصطلحات ملتے ہیں، اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہیں'

بجبرہ لکھ (لاکھ) کہار (صفحہ ۱۶۸) ٹھگ (صفحہ ۱۸۹) لونڈی (صفحہ ۱۹۲) ٹیکہ ہندوان (صفحہ ۲۲۰) منڈل (صفحہ ۲۱۶) گمٹی (صفحہ ۲۲۰) بی پٹواریاں (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۴۵) چبوترہ (صفحہ ۳۲۰) منڈھ (صفحہ ۳۴۴) لیموہ، چرائی ڈیہہ قصبات (صفحہ ۴۰۲) منڈہ، منڈی غلّہ (صفحہ ۳۰۴) ماش، موٹھ (صفحہ ۳۵۰) منڈئی (صفحہ ۳۰۴) مہین (صفحہ ۳۱۰) رپوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۳۰) دھادگان (جمع فارسی دھاوا بمعنی ڈاک دوڑیہ (صفحہ ۳۳۱) موڑہ (موڑھا، صفحہ ۲۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸) بی بی (صفحہ ۳۷۰) بھٹی (صفحہ ۳۱۶) (تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی) بی بی (صفحہ ۳۹) لک (لاکھ صفحہ ۴۸) لکھوک (جمع لاکھ (صفحہ ۳۳۱) چونہ پز (چونہ پکانے والا) راج (معمار) سوندھار (سونار، صفحہ ۳۳۱) بھیڑ، چھتر (صفحہ ۱۰۸) کنگرہ (کنگرہ، صفحہ ۳۷۱) چودھریاں (صفحہ ۳۷۰) لت (لات ۳۷۰) بھرکر (صفحہ ۳۹۳) گھڑیال (صفحہ ۳۴۳) گھڑیال خانہ (صفحہ ۲۷۱) درخت سینبھل (صفحہ ۳۱۱) چونہ (صفحہ ۳۱۰) (سراج عفیف)

"تاتارخاں اعظم نے عورتوں کی پردہ دار سواری کے لئے' گردونہا راست کنانیدہ بود کہ آنرا بزبان ہندی "بھرکر" گویند" (۳۹۳ سراج عفیف) محمد تغلق کی زبان سے ایک دفعہ ایک بے دینی کا فقرہ نکلتا ہے' مولانا عماد یر سر دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں "کہ مخور" (اخبار الاخیار صفحہ) فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے "چہ نام داری" ملک قبول بزبان ہندی گفت "تورا باند" اب اس کو "تورا باندھو" سمجھئے یا "تورا بندہ" (شمس سراج عفیف صفحہ ۱۶۰)

سلطان محمد تغلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رُخ کیا تو سندھیوں نے کہا۔

"برکت شیخ تھیا، ایک موا ایک نہا" (شمس سراج عفیف صفحہ ۲۳۱)

اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک دہلی کے علَم کے نیچے جمع ہو گیا تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متّحدہ زبان کا پیکر تیار رہا، جس نے عوام کے بازاروں سے اہل علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ جیسے ہمہ گیر سلطانِ ادب نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی۔ امیر کی فارسی مثنویوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال پائے ہیں، ان کی ہندی نظمیں جو پہیلیوں اور مکرنیوں کی صورت میں ہیں بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس ان کی ان ہندی منظومات کا کوئی مستند حصہ نہیں ہے، تاہم انھوں نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں جو طویل فارسی نثر لکھی اس میں اپنی ہندی نظم پر خود فخر کیا ہے فرماتے ہیں:

پیش ازین از بادشاہان سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم، مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آن سہ دیوان او عبارت است از عربی و فارسی و ہندوی اما در پارسیِ مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من، کہ درین کار قسامِ عادلم ع قسمت چنین بود چہ تدبیر کنم۔[1]

امیر کو اپنے ہندی کلام پر جو ناز تھا، وہ ان کے اس شعر سے نمایاں ہے جس کو انھوں نے اپنی اسی کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے:

چو من طوطیِ ہندم ار راست پرسی ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ میں ایہام کی ایک نئی صنعت پیدا کرنے پر فخر کیا ہے،

"بازا یہامی دیگر پیوستہ کردہ ام کہ یک طرف ہمہ ہندوی خیزی افتد و جانب دیگر پارسی می خیزد"

آہی آئی ہماں پیاری آہی ماری مارگی بائی موری ماہی[2]

امیر نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی ایک فضیلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے، کہتے ہیں:

ہست دوم آنکہ زہند آدمیاں جملہ بگویند زبان ہا بہ بیان

---

[1] خاتمہ غرۃ الکمال امیر خسرو قلمی دار المصنفین، [2] اس شعر کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

لیک از قصائے دگر ہر کسے — گفت زبار دِ سخن ہند بسے
ہست خطا و مغل و ترک و عرب — در سخنِ ہندوی با دوختہ لب

غرض ہر جگہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں، اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندی زبان اُس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں تھی،

حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری (المتوفی ۷۸۲ھ) جن کا وطن اور مسکن بہار ہے اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی، اور بیعت دلی جا کر حاصل کی تھی، ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں، جن میں بعض بیماریوں کی مجرّب دوائیں بتائی گئی ہیں، مثلاً

لودھ پھٹکری مرداسنگ — ہلدی زیرا ایک ایک ٹنک
افیون چنہ بھر مرچیں چار — اُردو پھر موتھا اس میں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے — نینا پیرا پل میں ہرے

(شفاء الامراض حکیم محمدی دیسنوی مرحوم قلمی دیسنہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے اُن کی زندگی ہی میں زین بدر عربی نے فارسی میں لکھی تھی، اور نذر گذرانی تھی، اُس میں ایک موقع پر اردو کے دو فقرے استعمال ہوئے ہیں، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی،

بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی پر سانکرے"

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا۔

بعد از ان بندگی مخدوم عظمہ اللہ بر زبان مبارک راند "دیس بھلا پر دور"

(معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار ۱۳۰۱ھ جلد اول صفحہ ۲۰۳)

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) کے کتب خانہ اصلاح میں ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہیں، جن میں اسی زبان میں مختلف اعداد کے جوابات بتائے گئے ہیں، اور اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے اس میں کل ستائیس فقرے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں،

۱۱۱ جو من کی ہنسی کیا ہوئی سو ہوئی

۱۱۳ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے،

۱۳۱ ابہیں ابھیں ناہیں،

۲۱۱ ابھیں ناہیں، سوت رہو جائے،

۲۲۱ راج پاٹ اچل کے دیا تمکون

۲۳۲ آگے برے دن گئے اب سکھ پاوہ گے

۲۳۲ ابھیں ناہیں آگو ہویگا

۲۱۱ توہرے دن کے اب سکھ سوجتا ناہیں،

اسی طرح حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (المتوفی ۸۰۹ھ) جن کا بڑا حصہ بنگال، بہار اور اودھ میں بسر ہوا اور کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں مدفون ہوئے، ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعہ لطائف اشرفی میں الفاظ، دعائیں اور منتر اردو نما ہندی میں ملتے ہیں، اس کے مؤلف نظام حاجی غریب یمنی ۸۰۸ھ میں ان کے مرید ہوئے تھے، اس مجموعہ میں ایک حکایت ہے کہ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ رودولی کے پاس سے گذرے اسی کے قریب ایک گاؤں میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے، سید موصوف ان سے ملنے کے لئے چلے کسی نے مولانا کو جاکر اطلاع دی، انھوں نے یہ خبر سنکر خاکساری کی راہ سے فرمایا: "مثل ہندوی فرمود چھیری کے ہنہ کھنڈا اساتے"[1] چھیری مشرقی اضلاع کے دیہاتوں میں بکری کو کہتے ہیں، اور کھنڈا، چاولوں کے چورا کو کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ بکری کو کھنڈا کھانے کو ملے یہ اس کی عزت افزائی ہے، یہ اشرف کی زبان سے سانپ اور بچھو کے کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں جو نسخ وکتابت کی غلطیوں سے مسخ ہو گئے ہیں بچھو کے کاٹے کا ایک منتر صاف ہے - دھر بندھوں دھر کندھوں سوالاکھ سپاری بندھوں اپنے بھگت گرو کے سکت "ہوں یکہ جوآگیں (آگے) چڑھے" دوسرا - اینکی لکڑی پانی پرائی، آنکس بندھوں زہر بس پرائی، مری یکہ جو آگیں (آگے) جائے دوسرا - کالی کوئی جنگل کے کاجل دھکا ناتھ پانچ چیز الخ[2]......

شیخ علاء الدین لاہوری پنڈوی بنگالی المتوفی ۸۰۰ھ اور شیخ نور الحق پنڈوی بنگالی المتوفی ۸۱۳ھ باپ

---

[1] لطائف اشرفی صفحہ ۲۰۰ نصرت المطابع دہلی [2] ایضاً صفحہ ۳۹۶

بیٹے تھے، یہ تھے تو لاہوری مگر سکونت بنگال جا کر اختیار کی، شیخ نور الحق اپنے مکتوبات میں ایک فارسی شعر لکھ کر اس کے ہم معنی ہندی شعر لکھتے ہیں،

همه شب بزاریم شد که صبا نداد بوی   ندمید صبح بخشم چه کنم صبا را

رین سب آئی سو یا سیج، بلدھا تھا نون   پیو نپوچھے پا تری مجھ سہاگن نا نوں

(صفحہ، قلمی دار المصنفین)

اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے شیخ امین الدین لکھنوی تاریخ وفات ۲۹ھ ہے یہ دونوں ہندی کے شاعر تھے، ان کے مکتوبات میں ہندی الفاظ، دوہے اور ہنڈولے ملتے ہیں، لکھتے ہیں "درشب روز تحریر "جگری" بخیال گذشتہ نبشتہ شدہ است ذوق خواہند گرفت، جگری مذکور اینست، ہندوی،

کون پراجت دیا کیتوں   شہ کل بانہہ نہ دئی کر سوتوں

عقدہ

مجھ برہا، رین جگاوے   ہور مرتین جال بتاوے

جی جن پنہوں بھول کندھیاے   جو بھنج تن جڑ کانٹ کنیاسے

عقدہ

جی ہوں سعد پیارے جینوں   سکھ وکھ پی کے بات کھیتوں

امین الدین مانڈی جودی پیو   شہ کے درسن داری جیو

مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی المتوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات میں بہتیرے فقرے ملتے ہیں شیخ نے کچھ زمانہ سنام (پنجاب) میں بسر کیا تھا، فرماتے ہیں کہ وہاں ایک زاہدہ بی بی رہتی تھیں جو بڑی عبادت گذار تھیں، رات کو تہجد میں شیخ سے پہلے اٹھتیں اور

ایں فقیر را بلطف می فرمود بزبان ہندی، بیٹا احمد آب گرم موجود است نباید کہ از آب سرد وضو کنی" (۱۹)

شیخ نے ایک مرتبہ شب در وقت پہنچا تھا،

Allah Akbar
اللہ اکبر

آہ شیخ احمد ماریو ماریو (صفحہ ۱۰۰)

شیخ نے ایک دفعہ یہ ہندی دوہرہ زبان مبارک سے ادا فرمایا

کنوا ہو تو پاٹوں، سمندر کہ پاٹن جاے   بارا ہو تو برجوں جھیل کہ برجن جاے

شیخ احمد عبدالحق ردولوی کے ملفوظات، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ المتوفی ۹۴۵ھ نے جمع کئے ہیں ردولی اور گنگوہ ہمارے صوبہ کے ابتدائی اور انتہائی کنارے کہے جا سکتے ہیں اس مجموعہ میں حسب ذیل الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، ہنڈولہ (صفحہ ۳۷) پلنگ (صفحہ ۳۸) اور اس سے بڑھکر جھلنگا چارپائی (صفحہ ۴۰) چبوترہ (صفحہ ۶۰) جنگل (صفحہ ۶۱) کھچڑی (صفحہ ۶۳) دھکا (صفحہ ۷۲) کنواڑہ (صفحہ ۸۷) دَبُر دبانے سے (صفحہ ۹۰) پالکی (صفحہ ۹۵) ویپک (صفحہ ۹۹) کندوری (کھانا صفحہ ۱۰۰) مہاجن (صفحہ ۱۲۳)

دکھنی اور گوجری وغیرہ

اب ہم اس زمانہ میں پہونچ گئے ہیں جب ہندوستان کی اس متحدہ زبان نے نظم کی زمین پر قبضہ کیا، شروع شروع میں یہ مذاقیہ اور تفریحی منظومات میں اسی طرح کام میں لائی گئی ہے جیسے ہمارے عہد میں اکبر مرحوم نے انگریزی لفظوں اور جملوں کا استعمال اردو شعروں میں کیا، مگر یہ ظرافت بہت جلد سنجیدگی سے بدل گئی، محمد تغلق نے ہندوستان و دکن کو ایک کر دیا اور دولت آباد دکن کو اپنی حکومت کا دارالسلطنۃ اور دلّی کو اجاڑ کر اہل دہلی کو دولت آباد میں لیجا کر بسایا، یہ پہلا دن تھا جس میں اس زبان کا تخم دکن کی سرزمین میں بویا گیا، یہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی راس آئی کہ تخم بڑھکر پودا ہوا، اور پودا ایک عظیم الشان درخت بن گیا، اور حیرت سے سنا جائے گا کہ اس درخت نے شمال سے پہلے دکن میں پھل دئے، تصوف اور عوام کے مذہبی جذبات نے اس زبان کو اپنے فیوض سے مالا مال کرنا شروع کر دیا، جس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ دکن کے بہمنی بادشاہوں نے آٹھویں صدی ہجری میں دہلی سے الگ ہو کر گلبرگہ میں جب اپنی نئی خودمختار حکومت قائم کی تو اپنا سرکاری دفتر فارسی کے بجائے ملک کی دیسی زبان میں رکھا، اس کے قدرتی نتیجے دو ہوئے، ایک تو یہ کہ برہمنوں نے سرکاری دفاتر میں جگہ پائی، اور دوسرا یہ کہ دیسی زبان نے ترقی شروع کی بہمنی سلطنت کے بعد جب عادلشاہی قطب شاہی وغیرہ پیدا ہوئے تو انہوں نے بھی اسی زبان کی سرپرستی کی، اور چونکہ شمالی ملک کے سلاطین کی طرح ان کے کابل و ایران سے تازہ بتازہ تعلقات نہ تھے، اور نہ وہ خود اجنبی نسل و وطن پر فخر کرتے تھے، اس لئے ان کے دربار کی زبان فارسی کے بجائے

ہندوستانی ہوگئی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کی مادری زبان تھی،

ہندوستانی مسلمانوں کی مادری زبان

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ – ۱۰۳۵ھ) جو تخت نشینی کے وقت تک جاہل رہا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس نے پڑھنا سیکھا اور فارسی پڑھی اس کے حال میں اس کے معاصر مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے:

"فارسی خواں گردید و بنوعے فارسی را خوب می گفت کہ تا ہندوستانی متکلم نمی شد ہیچ کس نمی توانست فہمید کہ غیر از فارسی بزبان دیگر آشنائی دارد" (ج ۲ صفحہ ۸۰ نولکشور)

اس اہم فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو ہندوستانی زبان کا وجود اور دوسری یہ کہ ان بادشاہوں کی عام بول چال کی مادری زبان یہی ہندوستانی تھی، جس میں ان کے عہد کی تصانیف ملتی ہیں،

موجودہ صوبہ جات متحدہ کی مادری زبان بھی اس عہد میں اسی قسم کی ہندوی یا ہندوستانی تھی، بدایوں جو مغلوں سے پہلے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے عبد القادر بدایونی جنہوں نے ۱۰۰۴ھ میں اپنی تاریخ لکھی ہے وہ اس وقت کے ایک نو سالہ (۹۱۴ھ کی ولادت) استاد شیخ عبد اللہ بدایونی کا حال لکھتے ہیں کہ بچپن میں وہ استاد سے بوستاں پڑھ رہے تھے شعر یہ آیا،

محال است سعدی کہ راہِ صفا ۔۔۔ تواں یافت جز از پئے مصطفیٰ

"پرسید کہ معنی ایں بیت چیست، بزبان ہندی بیان کنید۔۔۔۔ چوں معنی آں گفتہ۔۔۔۔" (ج ۳ صفحہ ۷۵)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی مادری زبان ہندوی ہو چکی تھی، اکبر کی زبان میں ملا بدایونی وغیرہ نے پنڈتوں کی مدد سے جس ہندی سے فارسی میں سنسکرت کتابوں کے ترجمہ کرتے تھے اس سے مراد یہی اس وقت کی اردو ہے، پنڈت سنسکرت سے اس وقت کی ہندوی میں، اور ملا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ملا نے ہندی جاننے کا کہیں دعوی نہیں کیا ہے،

شیخ عبد الوہاب متقی جن کا وطن مالوہ تھا، لیکن ۹۶۳ھ میں ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہاں ممالک اسلامی کے طلبہ کو درس دیتے تھے، اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر ملک کے طالبعلموں سے انھیں کی زبان میں تقریر فرماتے تھے، اس سلسلہ میں ہندیوں کو وہ ہندی میں سبق پڑھاتے تھے، شیخ عبد الحق دہلوی جو ان کے شاگرد

خاص تھے، اُن کے حال میں لکھتے ہیں:

"وباہندیان در تقریر فارسی تکلف نکنند وہم بزبان ہندی اکتفا فرمایند"[1]

یہ واقعہ بھی اس دعوے کی شہادت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان ایک مدت سے ہندوستانی ہو چکی تھی،

شیخ عبدالوہاب متقی کے استاد شیخ علی متقی مشہور محدث ہیں، ان کا آبائی وطن تو جونپور تھا، لیکن پیدائش برہانپور میں ہوئی اور ابتدائی ملازمت شاہانِ مالوہ کے ہاں منڈو میں کی، شیخ باجن کے مرید اور اُن کے لڑکے سے چشتی خرقہ پہنا، پھر ملتان جا کر شیخ حسام متقی کی صحبت اُٹھائی پھر ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ چلے گئے، کبھی کبھی سلاطین گجرات کے اصرار سے احمد آباد گجرات آجاتے تھے، ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، غور کیجیے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں سے رہا، جونپور (پورب) برہانپور (خاندیس) منڈو (مالوہ) ملتان (سندھ و پنجاب) اور احمد آباد (گجرات) بااین ہمہ جو ان کی زبان تھی وہ اُس دوہرہ سے ظاہر ہے جس کو وہ اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے مرض الموت کی حالت میں پڑھا، فرمایا کہ کھانے کو نہیں ڈالو،

"آں چناں سخن کن کہ ہمہ یکے شود و دوئی نماند، چنانچہ این دوہرہ خبرے دہد و میگوید[2] دوہرہ"

سن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی جیوں دودھ بتاتا

دیکھئے کہ اردو کی پوری شان اس شعر میں موجود ہے، یا نہیں،

تاہم اس میں شک نہیں کہ جب تک شمالی ہند میں حکومت کا رعب و داب قائم رہا، اس مادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور تصنیف و تالیف معیوب رہا اور اس کے برخلاف دکن اور گجرات میں خود صوفیہ نے اور شیعہ بادشاہوں نے پہل کی، صوفیہ نے اس زبان میں صوفیانہ رسالے لکھے اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں نے اس میں امام حسین علیہ السلام کے مرثیے اور مناقب لکھے اور رفتہ رفتہ شاعری کے دوسرے مضامین بھی بندھنے لگے، اور اس طرح نثر کے ساتھ نظم نے بھی دکن اور گجرات میں ترتیب و تدوین کی عزت پہلے پائی،

انجمن ترقی اردو اور دکن کے بعض دوسرے اہل قلم کا ہم سب کو ممنون ہونا چاہیے، جنہوں نے اس عہد کی دکنی

---

[1] تاریخ اردوئے قدیم حکیم سید شمس اللہ قادری، نقلاً از زاد المتقین الی طریق سلوک الیقین شیخ عبدالحق دہلوی قلمی،

[2] اخبار الاخیار ص ۲۴۹ مطبع ہاشمی میرٹھ،

نظم و نثر کتابوں کو حلیۂ طبع سے آراستہ کرنا شروع کر دیا ہے، یہ وہی ہندوستانی زبان ہے جس کو لوگ بعد میں دکھنی کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں،

اس کے صوبہ وار نام

حقیقت یہ ہے کہ نئی قوم کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور اس طرح اس نئی زبان کو بھی مقامی اور صوبہ دارانہ اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیوں میں منقسم کر دیا، دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی، ہر صوبہ کی ہندوستانی بولی میں علٰحدہ علٰحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے، اور اس لئے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ الگ پڑا مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی، یہ سب تفاوت اسی ایک کے نام ہیں،

اردو نام

تاہم یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے لیکر اب تک اس زبان کا نہ اب تک "اردو" سننے میں نہیں آیا، حالانکہ ہم نے آج اس نام کے سوا اس کے اور سب نام بھلا دیئے ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اُردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر شاہی یعنی لشکر گاہ اور کیمپ کے ہیں اور اس معنی میں اس کا استعمال بہت قدیم ہے یہاں تک کہ تغلقوں کی تاریخ میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بولا گیا ہے، پھر تیموریوں اور خصوصاً شاہجہاں کے عہد میں "اُردوئے معلیٰ" شاہی لشکرگاہ اور دہلی کے قلعۂ معلیٰ کو کہنے لگے، مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا، اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی، عام بازاروں اور گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اُس کا قبضہ پھیل رہا تھا، اس لئے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے "زبانِ اردوئے معلیٰ" کا خطاب دیا چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرۂ نکات الشعراء میر (صفحہ ۱) اور ذکر میر (صفحہ ۹۷) اور نوطرز مرصّع مرقع رقم تحسین میں یہ نام یعنی "زبان اُردوئے معلیٰ" کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پاتا ہے۔

تیرہویں صدی کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے، تذکرۂ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تالیف ہے، مرزا مظہر جان جاناں کے حال میں ہے،

"در زبانِ ہندی کہ مراد از اُردو است خیلے فصیح و بلیغ بود"

باغ و بہار وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور سے بولا گیا ہے، ان

حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نام کے طور پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے،
دہلی کے اردوئے معلی پر جب تباہی آئی تو گو دہلی کے علم و ادب اور شعر و سخن کا خزانہ لٹ گیا، مگر اس کا اتنا
فائدہ کہ حسبِ استعداد حصّہ رسدی کے مطابق، تمام صوبوں میں جہاں چھوٹی چھوٹی نوابیاں قائم ہو گئی تھیں، بزرگوں کا
یہ اندوختہ سرمایہ بٹ گیا، اہل علم دہلی سے نکل نکل کر پہلی منزل لکھنؤ میں، دوسری عظیم آباد میں اور تیسری مرشد آباد بنگال
میں کرتے تھے اور آخر میں ایک اور منزل ولیم فورٹ کلکتہ میں قائم ہوئی، بہت سے عزم و ارادہ والے ایسے بھی تھے جو
دکن وار کاٹ جا کر پناہ گزیں ہوئے، اور اس طرح پورے ملک میں اردوئے معلّٰی کی زبان نے اشاعت پائی، ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

سا یہ اس زبان کی مختصر تاریخ ہے جو آج ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور جو آج اس پورے ملک کی واحد متحدہ زبان ہے
اس واحد اور متحدہ زبان کے لیے مسلمانوں سے پہلے کوئی نام نہ تھا کہ نہ اس میں کوئی ایک متحدہ زبان تھی
اور نہ کسی متحدہ قومیت کا وجود تھا، اور نہ ایک متحدہ مملکت تھی، مسلمانوں نے آکر اس برِ اعظم کو ایک علَم کے نیچے ایک
مرکز کے ماتحت، ایک ملک بنایا، جس کا نام پہلے ہند اور پھر ہندوستان رکھا، اور ایک زبان پیدا کی جس کا نام زبان
ہند، لغتِ ہند، ہندوی، ہندی زبان ہندوستان اور ہندوستانی رکھا،

ہندی لفظ

آج کل جس کو "ہندی" کہتے ہیں وہ یورپ کی ایک صوبہ وار بولی ہے، جس کے لئے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے، مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں
سارا ہندوستان داخل ہو جائے، خود بدیسی ہے پھر بھی اس کے لئے ایسا نام اختیار کرنا اس لئے مناسب ہے کہ اس
سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے، ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے
ایک خاص جغرافی حصّہ کے ساتھ خاص ہو جائے،
اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو "ہندی" یا "ہندیہ" کہتے تھے، وہ سنسکرت یا پالی، سندھی
ملتانی، گجراتی، سب کو ہندی ہی کہتے تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق ۲۷۰ھ میں جس زبان میں
قرآن کا ترجمہ کیا گیا تھا اُس کا نام اس مصنف نے "ہندیہ" بتایا ہے،

ان یفسّر لہ شریعۃ الاسلام بالھندیۃ — شریعت اسلام کا ہندی میں حال لکھنے

(عجائب الہند صفحہ ۲)

ان یفسّر له القران بالھندیۃ (عجائب الہند صفحہ۲) قرآن کا ہندی میں مطلب بیان کرے'

اسی طرح الفہرست میں جو ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے' ہندوستان کی جس زبان سے عربی میں طب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں ان کے بیان میں ہندوستان کی زبان کا نام "ہندی" ہی رکھا گیا ہے'

نُقل من الھندی الی الفارسی (صفحہ۳۴۲ مصر) ہندی سے فارسی میں نقل ہوا'

اس لئے مسلمانوں نے اپنی حکومت کے بعد اس زبان کو جس کو ہندوستان میں آکر انہوں نے اختیار کیا' ہندی کا نام بخشا انتہا یہ ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ فرمایا' اس کو بھی ہندی ہی فرمایا' اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندی کی وسعت کہاں تک تھی' اور اس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہ تھا' ایک ہی زبان تھی جو پورے ملک پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی'

اردو اور ہندی کی تقسیم

لیکن انگریزوں نے دہلی کے اردوئے معلیٰ کو اجاڑ کر جب کلکتہ کے فورٹ ولیم میں اپنا نیا "اردوئے معلیٰ" بنا کر کھڑا کیا تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور مفیدداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی' مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا' پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے' چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے' ایک کو مسلمانوں کے سر تھوپا' اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا' اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں' یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے مہابھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے'

شاید آج لوگوں کو وہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق اس عظیم الشان درسگاہ کے پہلے بانی سے ہے' ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے' اسی سال بنارس میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط موقوف ہو کر ہندی بھاشا اور دیوناگری خط جاری ہو'

سرسید اُس وقت سے لیکر مرنے سے نو دن پہلے تک اس کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے اور انھیں کی مخالفت کا اثر تھا کہ اُن کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی۔ اُن کی وفات کے چند سال بعد غالباً ۱۹۰۰ء میں سر میگڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اس صوبہ میں ہندی کو قانوناً مساوی حیثیت بخشی، اور اُردو ہندی کی ناگوار بحث کا وہ تخم اس سرزمین میں بویا جس کو اس سے پہلے وہ بہار میں بوچکے تھے۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما لائبریری ہال میں سرسید کے جانشین اور اس درسگاہ کے سکرٹری نواب محسن الملک مرحوم کی صدارت میں اردو کے ماتم کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں مرحوم نے ایک دلگداز و موثر تقریر کے بعد اُردو کے لئے یہ مصرع پڑھا تھا؛ ؎

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور یہی وہ فضا ہے جس میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد پڑی، اور ہندی کو پنڈت مالوی کی کوششوں کے زیر پرستی روزافزوں ترقی ہونے لگی، ہندی اخبارات اور رسائل اور تصنیفات کا انتظام ہوا اور پورے ملک میں اردو اور ہندی دو حریف کی حیثیت سے صف آرا ہوئیں اور اب تک ہیں اور اب انہوں نے ہندو مسلمان دونوں کی دو الگ الگ زبانوں کی شکل اختیار کر لی ہے جو حد درجہ افسوسناک ہے،

علی گڑھ کی تحریک کا حصہ اردو زبان کی ترقی میں

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں نئی تحریک اور نئے تعلیمی و ادبی انقلاب کی آواز اسی درسگاہ کی چہار دیواری سے اٹھی ایک مولوی محمد حسین صاحب آزاد کو چھوڑ کر جو ایک مستقل ادبی ریاست کے بانی ہیں، باقی اُردو کے تمام علمبردار اسی کی ہمہ گیر سلطنت سے وابستہ تھے، اردو زبان کو قصص و حکایات اور قصائد و غزلیات کے تنگ کوچہ سے علوم و فنون کی شاہراہ پر جولاں وہ سرسید مرحوم ہی تھے، اردوئے معلٰی اور عود ہندی والے غالب کے بعد جس نے عروس اُردو کو سادگی کا گہنا پہنا کر تکلفات لاطائل کی گرانباری سے آزاد کیا، وہ اسی درسگاہ کا بانیِ اول تھا سرسید مرحوم کی اُردو کی پہلی تصنیف آثار الصنادید ۱۸۵۷ھ کے ہنگامہ سے پہلے مسجع و مرصع عبارت میں لکھی گئی تھی، مگر اس کا دوبارہ ڈایڈیشن صاف و رواں عبارت میں شائع ہوا،

گو یہ صحیح ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے سرسید کیا بلکہ غالب سے بھی پہلے سادہ نگاری کا آغاز کیا، مگر وہ تحریک صرف مذہبی دائرہ میں محدود رہ گئی، اسی طرح حیدرآباد میں نواب شمس الامراء بہادر

نے جدید علوم میں ستّہ شمسیہ نام اُردو رسالے تصنیف کئے اور دہلی کالج کے ماسٹر رامچندر نے پولیٹکل اکانمی کے ترجمے کئے، مگر یہ افراد کی محدود کوششیں تھیں، سرسید نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے باقاعدہ ایک علمی انجمن اس غرض سے قائم کی کہ علوم و فنون کی نئی نئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، آج جو مسلم یونیورسٹی پریس ہے اس کی بنیاد اوّل اسی سائنٹفک سوسائٹی کا پریس ہے، جو پہلے سرسید کا ذاتی پریس تھا، اس سوسائٹی کی طرف سے چالیس کتابیں چھوٹی بڑی، تاریخ اور سائنس کی چھپکر شائع ہوئیں،

سرسید نے اپنی کشش اتصال سے علم و ادب کے لیے متعدد استادوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک نظام شمسی تھا، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، اور بہت سے اہل قلم یکجا ہو گئے، جنہوں نے اپنی کوششوں سے اس بولی کو زبان کا درجہ دیدیا، اور ہر قسم کی ادائے مطلب کا اہل بنا دیا،

علی گڑھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی کی تاریخ میں بہت سے اوّلیات حاصل ہیں،

۱۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے اس زبان کے لئے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا،

۲۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ میں اس زبان کے مسلّم و مستند مصنف اور اہل قلم پیدا ہوئے،

۳۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور شائقین کے لئے فراہم کیا "علی گڑھ کالج بک ڈپو" آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا، جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں،

۴۔ اور سب سے آخر یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان اور زبان داں شہری اور قصباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا، اور جس طرح یہ زبان خود ایک مشترکہ زبان کی حقیقت کی مدعی ہے اسی طرح علی گڑھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزینہ دار بنایا، اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعووں کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زباندانی کا معیار قرار دیا، اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی جس میں ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر شہر کے اہل قلم اور اہل علم برابر کے شریک ٹھہرے، سرسید دلّی کے تھے، محسن الملک اٹاوہ کے، مولانا حالی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی اعظم گڈھ کے، مگر ان سب کی تصنیفات نے مل کر اس

زبان کا ایک متحد معیار مقرر کردیا، سرسید مرحوم نے جس دن مولانا شبلی کی المامون پر یہ فقرے لکھے:

"یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

(دیباچہ طبع دوم المامون)

تو درحقیقت انہوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنو اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خطِ فرمان لکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہل قلم کو زبان کھولنے کی جرأت، اور اپنی اپنی بساط کے مطابق عرضِ متاع کی ہمت ہوئی، اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی سامانوں اور ذخیروں سے مالا مال ہونے لگا،

موانع کے باوجود اردو کی ترقی

اس انقلاب نے ملک میں علوم و فنون، اور سنجیدہ علوم کی تصانیف کا روز افزوں ذخیرہ فراہم کردیا، اور وہ زبان جو پہلے صرف چند دیوانوں اور کہانیوں کی مالک تھی، وہ ہر قسم کے علم و ہنر سے معمور ہوتی جاتی ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں حکومت و سلطنت کی ذرا بھی مدد شریک نہیں ہے بلکہ لوکل سلف گورنمنٹ کی تعلیمات کا جہاں تک تعلق ہے اردو کو اپنی اشاعت میں ایک انگلی کا اشارہ بھی نہیں مل رہا ہے، حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہندی پرچارنی سبھا نہ صرف اس صوبہ کی گورنمنٹ کی مالی امداد سے بار بار مستفید ہوئی ہے، بلکہ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے تعلیمی نصابوں کے وسیع سلسلہ کے ذریعہ ہندی، دیہاتی اور شہری رقبوں پر روز بروز قبضہ کرتی چلی جاتی ہے، شاید یہ بیان تعجب سے سنا جائے کہ ہندو پبلشروں اور کتابوں کے انتخاب کی کمیٹیوں میں ہندو ممبروں کی کثرت کے سبب سے نصاب میں کسی ایسی کتاب کا داخل ہونا اور چلنا ممکن نہیں جس کی اردو ہندی نہ ہو،

یہ واقعات شکایت کے طور پر نہیں لکھے جارہے ہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ ہماری زبان کو گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے کسی ادارہ سے کسی قسم کی امداد نہیں مل رہی ہے، پھر بھی اس کی ترقی جاری ہے،

اُردو ایک اور امداد سے بھی قدرۃً محروم ہے اس بات کی پُرزور کوشش کی جارہی ہے کہ آیندہ "ہندی قومیت" کی مشترکہ قومی زبان ہندی ہو جائے، اس خواہش کی تکمیل میں کانگریس سے لیکر ناگری پرچارنی سبھا تک یکساں شریک ہے، کانگریس اور دوسری پولٹیکل جلسوں میں جن میں گو ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں، ہندو نوجوان اپنی تقریر ایسی زبان میں کریں گے جن کو جلسہ کے نصف حاضرین نہیں سمجھ سکتے، اکثر اُن تجویزوں کی تائیدوں کی عزت

مسلمانوں کو حاصل کرنی پڑی اور کرنی پڑتی ہے کہ جن کی "ہندی پرستاؤ" کا ترجمہ اردو میں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات: ایک اور چل گئی ہے کہ اردو نے جن ہندی لفظوں کو اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے کینڈے کا بنا لیا ہے، کوشش کی جارہی ہے کہ اب اُن کو اصل ہندی تلفظ کے مطابق ادا کیا جائے،

دوسری طرف ہندو ریاستوں نے ایک ایک کرکے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنانا شروع کردیا ہے، گجراتی والیِ ریاست بڑودہ اور اردو والیِ ریاست الور سے لیکر ماڑواڑ کشمیر اور راجپوتانہ تک یہ تحریک عام ہو رہی ہے، ان سب کے جواب میں ہمارے پاس صرف ایک چیز ہے، وہ سرکار نظام خلد اللہ ملکہ لیکن میری پیشینگوئی یہ ہے کہ ان سب حالات کے باوجود ہندوستان کا مستقبل اردو کے ہاتھ میں ہے، ہندوستان میں جب تک مختلف قومیں باقی ہیں اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات قائم ہیں، اس میں ایک ایسی زبان کا وجود جیسی کہ اردو ہے ناگزیر ہے،

ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے ہیں تو اُس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا، وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت کابل و بلوچستان سے لیکر بغداد تک فارسی حکمراں ہے، اور دوسری طرف سواحلِ عرب وافریقہ سے لیکر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہے، ان تمام بیرونی قوموں کے لئے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اردو ہے، یہی سبب ہے کہ یہ زبان اُن تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے جہاں ہندوستانیوں کی آمدورفت ہے، برما، آسام، سیلون، مالدیپ، انڈمان، ماریشس، سنگاپور، پورٹ بلیر، اور افریقہ کے اُن مختلف ملکوں میں جہاں جاکر ہندوستانی بسے ہیں، اس زبان کو اپنے سینوں سے لگاکر ساتھ لے گئے ہیں، ادھر سواحلِ عرب میں عدن، جدہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے، انتہا یہ ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحوں اور مصر کے بازاروں تک میں اس کے بولنے والے ملے ہیں، کیا اس پر آپ کو حیرت نہ ہوگی کہ قسطنطنیہ میں اردو سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہ وغیرہ کے ترجمے براہ راست ترکی میں ہوئے، مکہ معظمہ میں مجھے ماسکو کے ایک عالم موسی جار اللہ سے ملاقات ہوئی جو اردو تصنیف ارض القرآن کو ہندوستانیوں سے پڑھتے تھے ادھر عربی درسگاہوں اور مسافروں اور تاجروں کے ذریعہ یہ زبان یاغستان، افغانستان، بخارا بلکہ چینی کاشغر تک اپنا سلسلہ لاچکی ہے،

ہندوستان میں پشاور سے کسی ریل پر بیٹھکر آپ ہندوستان کے جس گوشہ میں بھی جائیں قلی، اہل اسٹیشن، خوانچہ فروش، مسافر، صاف صحیح نہ سہی تو جو ٹوٹی پھوٹی زبان وہ بولتے چلتے اور سمجھتے آپ کو سنائی دیں گے وہ یہی زبان ہوگی۔

ہندوستان کے پورے طول وعرض میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں خواہ اُن کی مادری زبان کچھ ہو اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اُن صوبوں میں اردو کی تعلیم کے کتب اور اسکول قائم ہیں اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔

اس موقع پر ناشکری ہوگی اگر پنجاب کے اُن خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو اُس نے اس زبان کی اشاعت کی انجام دیں لاہور ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے مولانا حالی مرحوم سب سے پہلے سیراب ہوئے اور گو شمس العلما محمد حسین آزاد دلی کے تھے، مگر اُن کے ادبی فضل وکمال کی شہرت کی خوشبو اسی مشک زار سے نکل کر پورے ملک میں پھیلی، اگر علی گڑھ کا تہذیب الاخلاق اردو کا پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو پرانے بزرگوں کے تجربہ کار قلم نے وجود بخشا تھا تو لاہور کا مخزن پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو جدید تعلیم یافتوں کے پُرزور دست وبازو نے نکالا اور چمکایا اور جس کے بعد دوسرے ادبی رسالے نکلے اور بڑھے، یہاں تک کہ آج اس وسیع ملک کا کوئی ممتاز شہر ایسا نہیں جس کو اردو کے کسی ادبی رسالہ کے مولد اور نہ سہی تو مدفن بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔

اردو اخبارات نے بھی اس زبان کی ترویج اور اشاعت میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے، اور کس قدر خوشی اور مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ آج پشاور کی پہاڑیوں سے لیکر بمبئی، رنگون مدراس اور کراچی کے سواحل تک اردو اخبارات پھیلے ہیں، اور اکثر صوبوں سے روزانہ اخبارات نکل رہے ہیں، اور ہفتہ وار صحیفے اور ماہوار رسالوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے بلکہ ہندوستان سے باہر جہاں بھی ہندوستانی آباد ہیں۔ اس زبان کے پیغامبر موجود ہیں، اور آج ہندوستان کے جس شہر میں کوئی خطیب چاہے، اپنے لئے سامعین کا گروہ پا سکتا ہے، ایسے بھی موقع آئے ہیں کہ انگلستان اور امریکا تک سے کبھی نولٹے کیمبرج اور کبھی صدائے وطن سنائی دی ہے۔

ہندوستان کی اس زبان نے یہاں تک وسعت پائی ہے کہ یورپ کی یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں اس نے اپنی جگہ حاصل کرلی ہے، کیا ہمارے لئے یہ فخر کی بات نہیں کہ ہماری زبان سے انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی میں تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں، چند ہفتے ہوئے کہ پوٹسڈم واقع جرمنی سے میرے پاس ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایک جرمن ڈاکٹر کا خط موصول ہوا،

ہندی کی اشاعت اردو کے لئے مفید بھی ہے

ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں ہندؤں میں اردو بہت کم رائج ہے، جیسے مدراس اور بنگال اگر وہاں ہندی کا رواج دوسری زبان کی حیثیت سے ہو جائے تو میرے خیال میں یہ بھی ہندوستان کے لئے نہایت مفید ہے اول یہ کہ کم از کم کوئی ایک زبان تو ہندوستان کے منہ میں ہوگی، دوسرے یہ کہ ہندی اردو کا ایک درمیانی زینہ ہے مجھے ایک دفعہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا، ریل میں ایک مدراسی ہندو بزرگ کے سوا کوئی رفیق نہ تھا، وہ ناگری پرچارنی سبھا کی مدراسی شاخ کے ذریعہ ہندی سیکھ رہے تھے، اتنے سہارے پر یہ ممکن ہو سکا کہ ہم انگریزی کی مدد لئے بغیر ایک دوسرے کی کچھ سمجھ سکیں،

قوموں کی تخلیق میں زبان کا درجہ

اصل یہ ہے کہ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی پیدائش اور ترقی میں اس کی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے انسان جانوروں کو تو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں، لیکن جب ایک انسانی قوم دوسری انسانی قوم کو اپنی تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منہ میں لوہے کی لگام نہیں لگاتی، تاہم اس کے منہ میں ایک لگام لگا دیتی ہے، جس کا نام "بدیسی زبان" ہے، انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں، خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے، الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں، اس لئے کسی دوسری قوم کی زبان کے معنی اس قوم کا تمدن، تاریخ مذہب، جذبات ہر چیز ہیں،

آپ جب انگریزی پڑھتے ہیں یا انگریزی بولتے ہیں، تو نادانستہ طور سے آپ کے جسم و جان اور ارادہ و روح انگریزی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، زبان کے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، استعارات، ہر چیز اس زبان کی قوم کی جیتی جاگتی تاریخ ہوتی ہے، اور یہ تاریخ اس قوم کی زندگی کی تجلیوں کا خزانہ ہوتی ہے، جب آپ انگریزی بول رہے ہوتے ہیں، غور کیجیے گا کہ اس وقت آپ اپنے اندر انگریزی تاریخ، انگریزی جذبات، انگریزی احساسات، انگریزی خیالات کا سر تا پا مجسمہ بن جاتے ہیں، اور خود اپنی تاریخ اپنے قومی جذبات اپنے مذہبی احساسات اپنے ادبی خیالات سے یکسر عاری ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے آداب و معاشرت، طرز تمدن، لباس و پوشاک، لب و لہجہ ہر چیز میں اس بدیسی قوم کی نقالی کرنی پڑتی ہے، اب ایسی قوم جو قلباً و قالباً، روح و جسم، ظاہر اور باطن دونوں میں

دوسری قوم کی نقالی کررہی ہے، خود اپنی قومیت کا وجود اس کے اندر کہاں رہا، اب وہ ایسے افراد بن گئے ہیں، جو اپنی قومیت کے عناصر کو توفنا کرچکے ہیں، مگر دوسری قوم جس کی وہ نقالی کررہے ہیں، وہ اپنے اندر ان کو شمار کرنے سے رہی اس لئے ان کی حیثیت "معزز اچھوت" سے بڑھ کر نہیں،

اس مختصر بیان سے اس نتیجے کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہئے کہ قومیت کی تخلیق میں زبان کا درجہ مذہب کے بعد سب سے بڑھکر ہے، اگر اس نکتہ کو ہم اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں، تو یقین کرنا چاہئے کہ ہم اب تک قومی حقیقت کی معرفت سے کوسوں دور ہیں،

ہم غیر زبانوں کے سیکھنے میں عمر برباد کرتے ہیں، اور بدیسی جذبات وخیالات کی نقالی سے اپنی قومی ترقی کا مجنونانہ خواب دیکھتے ہیں،

مادری زبان میں تعلیم

آج دنیا کے وسیع عرصۂ کائنات میں ہزاروں قومیں آباد ہیں، کیا کسی ایک قوم کا بھی نشان دیا جاسکتا ہے، جس نے غیر مادری زبان میں تعلیم کے ذریعہ ترقی کی منزل مقصود کو پایا ہے، خود مسلمانوں نے اپنے عقلی علوم وفنون کا بڑا حصہ یونانیوں، مصریوں، ہندوؤں، اور ایرانیوں سے حاصل کیا، مگر اس طرح نہیں کہ انہوں نے دمشق وبغداد، اور شیراز وقرطبہ میں بدیسی زبانوں کی درسگاہیں کھول دی ہوں، بلکہ اس طرح کہ تمام زبانوں کے علمی خزانوں کو ان کی زبانوں سے لیکر اپنی زبان میں منتقل کرلیا، بے شبہ دوسری علمی زبانوں کا سیکھنا بھی ترجمہ وتشریح کے لئے قومی ترقی کے سفر کی ابتدائی منزل ہوتی ہے، مگر وہ خود قومی ترقی کے ہر سفر کی منزل مقصود نہیں ہوتی، وہ ایک عارضی گذرگاہ ہے، دائمی قیام گاہ نہیں،

خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے بہادرانہ اقدام نے ہندوستانیوں کے اس بزدلانہ عقیدہ کو زائل کردیا ہے کہ دیسی زبان تعلیم کا ذریعہ نہیں بن سکتی، اور حوصلہ دلایا ہے کہ حیدرآبادیوں کی پیروی میں پورا ہندوستان اپنا سفر شروع کرے، ہندوستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی کلکتہ یونیورسٹی نے بھی اپنا چولا بدلنے پر آمادگی ظاہر کی ہے، اور میٹرک تک دیسی زبان ذریعۂ تعلیم بنادی ہے،

ہمارے صوبہ کی دوسری قومی درسگاہ ہندو یونیورسٹی بھی ہندی کو میٹرک تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا اعلان کرچکی ہے، اس سے ہندی زبان کی ترقی واشاعت اور ہندو قومیت کی تخلیق کا جو فائدہ اس قوم کو پہونچے گا

اس کا اندازہ آسان ہے، کیا ہماری قومی درسگاہ اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرے گی؟

اگر کبھی مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اس درسگاہ کی تعلیمی زبان اُردو ہوگی، تو آپ کو چند سال میں معلوم ہو جائے گا کہ اُردو زبان کہاں سے کہاں پہونچ گئی، واقعات کی بنا پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے اپنی پندرہ سال کی زندگی میں علوم و فنون اور زبان اور قوم کو جو فائدہ پہونچایا ہے، وہ ہماری بدیسی یونیورسٹیوں نے ساٹھ اور ستر سال کی زندگیوں میں بھی نہیں پہونچایا، حیدرآباد میں علمی انقلاب ہو گیا ہے، تصانیف، تحقیقات اور جدتِ خیالات کی نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے، اور پیدا ہونے کی امید ہے،

آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کا وائس چانسلر حیدرآباد کی اس تعلیمی کشتی کا ناخدا تھا، اگر وہ ہمت کرے تو کول کی سرزمین میں بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے جو دکن کی سرزمین میں ہو رہا ہے، اصطلاحات کی مشکلیں ختم ہو چکی ہیں، علوم کی قابل نصاب کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہو سکتی ہیں، اور اب اچھے سے اچھے زباں داں اور مستند پروفیسر ہاتھ آسکتے ہیں بیشک بعض نئی کتابوں کے ترجمہ کی دقت اُٹھانی پڑے گی، لیکن اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اردو کے موجودہ اداروں سے امداد و اعانت لی جائے، اور باہمی اشتراکِ عمل سے اس کام کو انجام دیا جائے خود جامعہ عثمانیہ نے اپنی بہت سی کتابیں انجمن ترقی اُردو جامعہ ملیہ اور دار المصنفین کے بعض ممبروں سے ترجمہ کرائی ہیں، اور وہ پسند کی گئی ہیں،

اُردو کے موجودہ ادارے

اس وقت اُردو کی خدمت کے لئے ملک میں متعدد مجلسیں قائم ہیں، اور ہر ایک اپنی اپنی بساط بھر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اردو کی خدمت کی سب سے پرانی مجلس انجمن ترقی اُردو ہے، جو تیس سال سے برابر اپنے کام میں لگی ہے، اور اس وقت تک تقریباً ستر کتابیں جن میں زیادہ حصہ ادبیات کا اور پھر سائنس کا ہے وہ شائع کر چکی ہے، اس کے بعد دار المصنفین ہے جس نے اپنی اٹھارہ سال کی عمر میں پچاس کتابیں شائع کی ہیں، جن میں بڑا حصہ اسلامی تاریخ، اسلامی علوم اور جدید فلسفہ کا ہے، عمر میں تیسرا اور کام میں سب سے پہلا درجہ جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ کا ہے، جس نے اپنی سولہ سترہ سال کی محنت میں سائنس ریاضیات، سیاسیات، نفسیات، فلسفہ، طبعیات، تاریخ اور مختلف علوم و فنون کی درسی کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈمی کا نام بھی لینا چاہیے جس نے بعض فلسفیانہ تراجم اور اقتصادیات

بچوں کی تعلیم و تدریس اور مطالعہ کے لئے تاریخی، مذہبی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں، آخر میں ہم ایک اور ادارہ کا نام لینا چاہتے ہیں جس کا شمار اب تک اردو کے محسنوں میں نہیں، حالانکہ حق ہے کہ ہم اس کے خدمات کا کم از کم اعتراف کریں، یہ اسلامیہ کالج پشاور ہے، جس کے بعض اساتذہ نے ہماری زبان میں سائنس اور خصوصاً فلکیات پر متعدد کتابیں پیش کی ہیں، آئینسٹن کے نظریۂ اضافیت اور ریڈیو پر ضخیم کتابوں کا، معاوضہ اور اجرت کی توقع کے بغیر لکھنا اور چھاپ کر شائع کرنا، ہمارے خالص شکریہ کا مستحق ہے،

جی چاہتا تھا کہ اس موقع پر مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی لوں، جہاں کے اساتذہ بھی انفراداً کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، مگر سوال اردو کا ہے ؟ میری ایک دیرینہ تحریک ہے کہ مسلم یونیورسٹی سیریز کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے، اور جو "باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شروانی" چھپکر ملک کو اپنے کارناموں سے روشناس کرائے، میر ولایت حسین صاحب خدا ان کی عمر میں برکت دے گواہی دیں گے کہ جب "علی گڑھ کالج بک ڈپو" اردو کی مستند تصانیف کا تنہا ذخیرہ تھا، وہ کالج کے لئے ذریعۂ امداد تھا ؟ یا بارِ دوش ؟ بہرحال مسلم یونیورسٹی میگزین، حیوانیات اور طبیہ کالج میگزین اس یونیورسٹی میں ہماری امیدوں کا سہارا ہیں،

عزیزانِ جامعۃ المسلمین ! آپ کی یہ تعلیم گاہ پچاس سال تک مسلمانوں کی امیدوں کا قبلہ رہی ہے اور اب بھی ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ یہ قبلہ اپنا منہ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کرلے، اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھے، یہ درسگاہ تمام ہندوستان کے اسلامی صوبوں کا نچوڑ ہے، اگر اس زبان کی اہمیت نے اس درسگاہ کے دل پر قبضہ پالیا ہے، تو پورے ہندوستان کا میدان اس کے ہاتھ میں ہوگا، دیکھنے والوں کو ہندوستان کے تعلیمی مطلع میں عظیم الشان انقلاب کا غبار اڑتا دکھائی دے رہا ہے، اس کے لئے ابھی سے تیاری کرنا ہے،

ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہے گا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا اتنا ہی اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہشیار رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھکر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہیں، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے، مگر ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک

ایسا ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا،

عزیزو! ملک کے سیاسی لیڈر سیاسی سوراج کے لئے لڑ رہے ہیں، آؤ ہم تم ملک کے "زبانی سوراج" کے لئے اپنی جدوجہد شروع کریں، ہمارے وطنی بھائیوں نے عزم راسخ کر لیا ہے، اب تم کو اپنے عزم راسخ کا اعلان کرنا ہے،

چند مشورے

ہم کو یقین ہے کہ اگر اس زبان کے حامی تھوڑی سرگرمی دکھائیں تو اس بنا پر کہ اس زبان کی طبعی صلاحیت ہندوستان جیسے ملک کے بالکل مطابق ہے، یہ زبان بھی ہر مخالفانہ کوشش کے باوجود اس ملک میں پھیل کر اور بڑھ کر رہے گی، ضرورت ہے کہ اس زبان کے اہلِ قلم اور زباندان اس زبان کی آسانی اور سہولت میں کچھ اصلاحات قبول کرلیں،

۱۔ اس سلسلہ میں ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام "اردو" جو صرف سوڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں اس کا نام **ہندوستانی** رکھیں، اور اسی کو شہرت دیکر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب و موسوم ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہونچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجائے اس کا "ہندوستانی" نام ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترک وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے،

عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں ہے، ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں فرشتہ کی زبان سے یہ فقرہ آپ کو سنایا ہے،

"بنوعے فارسی راخوب می گفت کہ تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"

دیکھئے کہ اس زبان کا یہ نام کتنا قدیم ہے، شاہجہاں کے دربار میں مغل خاں گویا کا نام اس وصف کے ساتھ آتا ہے،

"درین عہدِ سعادت مہد سرآمدِ نغمہ سرایانِ ہندوستانی زبان است"

(بادشاہ نامہ لاہوری ۲ صفحہ ۶)

ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترک وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ "اردو" میں چھپی ہے ہم کو نجات دیگا،

۲۔ اردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو لفظ آکر مل چکے ہیں، اور وہ ہماری زبان کا جز بن چکے ہیں، ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہیے، الّا یہ کہ علمی اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی منگنی مانگنے کی ضرورت پیش آئے،

۳۔ لفظوں کی عربی اور فارسی جمع، اور واو عطف اور فارسی اضافتوں سے جہاں تک ہو سکے بچا جائے اور ان کی جگہ ہندوستانی جمع، اور عطف اور اضافت کو رواج دیا جائے،

۴۔ ہندی کے اُن لفظوں کو جو ہندوستانی میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سینکڑوں اچھے اور پیارے لفظ تھے، جن کو ٹکسال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے، اب آج کل کی نئی تحریک میں، پرچار، پریم، دیس، سوراج، سماج اور ایسے بیسیوں لفظ ہیں، جو ہمارے سیاسی مقرروں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور وہ ہم کو اب اجنبی اور بیگانے نہیں لگتے،

عزیزان جامعہ المسلمین! یہ "ادبی وعظ" جو کافی حد تک لمبا ہو چکا ہے، بہتر ہے کہ اور لمبا نہ ہو، ہم اپنے اس طولانی بیان کی معافی چاہکر، آپ سے رخصت ہوتے ہیں، والسلام

سید سلیمان ندوی

اُردو کیوں کر پیدا ہوئی

(سید سلیمان ندوی شبلی منزل اعظم گڑھ)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک میں کبھی ایک بولی نہیں بولی گئی، درحقیقت یہ ملک ایک برِاعظم ہے، جس میں ہر زمانے میں مختلف قومیں اور مختلف نسلیں جو مختلف بولیاں بولتی تھیں، آباد تھیں، آباد ہیں اور آباد رہیں گی، دنیا کی زبانوں کی تین مشہور اصلیں آریائی، تورانی اور سامی تینوں یہاں دوش بدوش ملی جلی ملتی ہیں، ڈریوڑی زبانوں کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبوں کی دوسری زبانیں آریائی ہیں اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے۔

چند مشہور راجاؤں کے زمانوں کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصے پر حکمراں رہے، اکثر ہندوستان کا یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے، مختلف مستقل ریاستوں کی صورت میں رہے، ان صوبوں کی وسعت راجہ کی قوت اور فتوحات کے دائرے کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ہر ریاست کی زبان اس کے صوبے کی مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا اسی حد تک اس زبان کا جغرافی دائرہ کبھی گھٹ جاتا اور کبھی بڑھ جاتا۔

مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی، برج کی بھاشا، مگدھ کی زبان، اطراف دہلی کی ہریانی یہ چاروں ہمسایہ ہیں مگر ان کی حدیں اپنی سلطنتوں کی حدوں سے وابستہ نظر آتی ہیں، مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا جب ہندوستان پر چھا گئی تو اس کی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بن گئی اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لے کر مہاراشٹر کے کناروں تک ملتے ہیں۔

ہندوستان میں سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں کے جہازوں کا گزرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیوں کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے خصوصاً

سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جز بنتا رہا، اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریے کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جا رہی ہے۔

بہرحال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لے کر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمے کے قریب ساتویں صدی عیسوی میں فتح فارس کے بعد عربوں نے بھی ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلّہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہوں سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہو کر چین تک جانے لگے، ان جہازوں کے چلانے والے، فارسی اور عربی بولتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہوں سے یہ گزرتے ہوں وہاں ان کی زبانوں کے کچھ الفاظ مستعمل ہو جائیں اور وہاں کی مقامی زبانوں کے کچھ لفظ ان جہازیوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں، چنانچہ اس کی مثالیں عرب سیاحوں اور ملاحوں کی زبانوں میں ملتی ہیں، چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر کے بندرگاہوں تک پہنچ گئی ہے اور خود مجھے عدن، جدّہ، پورٹ سعید، مصوّع اور پورٹ سوڈان میں ہندوستانی بولنے والے ملّاح اور دوکان دار ملے۔

اس موقع پر سب سے پہلا بیان ہمارے سامنے ایک ایرانی آمیز عرب جہازراں بزرگ بن شہریار کا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازراں ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ:

"میں ۲۸۸ھ میں منصورہ (بھکر) میں تھا، وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے یہ بیان کیا کہ الرا (الور) کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے بیچ میں تھی اور جس کا نام مہرگ بن رائق (؟) تھا، اس نے ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اس کو بتائے، تو عبداللہ نے منصورہ میں ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر تھا اور جس نے ہندوستانیوں میں نشو و نما پائی تھی اور جو اہل ہند کی مختلف زبانوں سے واقف تھا، اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کو بھیجا۔ راجہ نے اس کو بلا بھیجا اور اس کے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا"[1]

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار صفحہ ۳ - پیرس

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل میں بھی بہت سی مختلف زبانیں تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بولتے تھے اور ان میں یہ لیاقت رکھتے تھے کہ وہ ان میں شاعری کر سکتے تھے اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کر سکتے تھے۔

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرناموں اور تاریخوں میں مذکور ہے، اس واقعہ کا زمانہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے۔

اس کے ۳۳ برس کے بعد مسعودی ہندوستان آتا ہے وہ ۳۰۳ھ میں یہاں آیا تھا، وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے:-

"اس کے بعد ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہوگئے اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے اور ہر شخص نے اپنی ریاست الگ کر لی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج پر دوسرا راجہ ہوا اور کشمیر پر تیسرا راجہ تھا اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات و کاٹھیاواڑ) بلہرا (وبلبھ رائے) کی حکومت ہوئی اور اب تک ہمارے زمانے تک جو ۳۳۲ھ ہے یہ راجہ اسی لقب سے ملقب ہے اور ہند کی زمین بہت وسیع زمین ہے خشکی پہاڑ اور دریا میں پھیلی ہے ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ ؟) سے ملتا ہے جو جزیروں کے بادشاہ "مہراج" کا دارالمملکت ہے اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہے، لیکن ہندوستان کی طرف منسوب ہے اور دوسری طرف کوہستان سے متصل خراسان اور سندھ اور تبت تک ہے اور ان (ہندوستانی) ریاستوں میں باہم اختلاف اور لڑائیاں ہیں اور ان کی زبانیں الگ الگ ہیں اور ان کے مذہبی خیالات مختلف ہیں زیادہ تر لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے"[1]

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال میں کہتا ہے:-

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے ... مانگیر کی زبان جو بلہرا (وبلبھ رائے) کا دارالسلطنت ہے کیری ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تانہ (نزد بمبئی) کے پاس کی زبان لاری ہے"[2]

---

[1] مروج الذہب مسعودی ج اول ص ۱۶۲ پیرس [2] ایضاً ص ۳۸۱

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانوں کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے، اس کے بعد بغدادی سیّاح اصطخری کا زمانہ ہے جو ۳۴۰ھ میں آیا تھا وہ کہتا ہے :-

" منصورہ (موجودہ بھکّر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے"[1]

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامے میں ملتے ہیں، اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہے وہ کہتا ہے :-

" منصورہ (بھکّر)، اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے"[2]

۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں بشّاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال میں لکھتا ہے :-

" اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے"[3]

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ کی بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے :-

" دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چاروں طرف سو گانوں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے، یہ سب سوداگر ہیں، اُن کی زبان سندھی اور عربی ہے"[4]

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے وہ سندھ کی زبانوں کی نسبت، جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے :-

" یہ لوگ مختلف زبانوں، اور مختلف مذہب والے ہیں اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہیں، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ اُن کے ہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں، میں نے (بغداد کے) قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے کہا گیا کہ یہ بودھ کی مورت ہے .... اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا"[5]

اب وہ زمانہ آیا، جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا اور ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا، اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین میں صلح اور

[1] سفرنامۂ اصطخری ص۱۷۷ لائیڈن ۱۲ [2] سفرنامہ ابن حوقل ص۲۳۲ لائیڈن ۱۲ [3] سفرنامۂ بشاری معروف بہ احسن التقاسیم ص۴۸۱ لائیڈن ۱۲
[4] سفرنامۂ بشاری ص۴۷۹ ۱۲ [5] کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص۲۴ ۱۲

لڑائی کے تعلقات قائم تھے، آمد و رفت، لڑائی بھڑائی اور صلح و پیام کے لئے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آ گیا تھا، اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی[1] اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان و ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے۔

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شد از ہند و خلج وا زہر دستی[2]"

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جو بچپن میں شیراز پہنچ گیا تھا اور فارسی سیکھ لی تھی اور ہندوؤں کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی۔

"خطی نیکو ہندوی فارسی داشتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ ...... و ادرا دبیری و ترجمی کردے با ہندوان[3]"

ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگیں میں اپنے زمانے یعنی سلطان مسعود (۴۲۱ھ - ۴۳۲ھ) کے عہد میں اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا۔

"ہم چناں بیربل بدیوان ما[4]"

سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۳ھ میں جب سلطان کی شان میں ہندی میں شعر لکھکر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ میں ہے:-

"و نندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آں را بفضلاے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفریں کردند[5]"

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا، اس زمانے میں بھی سلطان کے دربار میں عرب و عجم اور ہند کے فضلاء پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے، اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھیں اور مزہ لیں۔

غزنوی بادشاہوں کے زمانے میں جب پنجاب غزنین کا صوبہ تھا، ہزاروں لاکھوں مسلمان جن کی زبان

---

[1] قابوس نامہ (۴۷۵ھ) باب در رسم بندہ خریدن ۱۱ [2] تاریخ بیہقی ص۲۳۲ و ۲۶۴ کلکتہ [3] ایضاً ص۲۳۰ [4] تاریخ بیہقی ص۲۶۶ کلکتہ [5] طبع نولکشور

فارسی تھی، پنجاب میں بس گئے تھے، ظاہر ہے کہ ان میں اور عام اہل ہند میں بول چال اس طرح ہوگی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہوں اور چند روز میں یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمان ہندی میں یا فارسی آمیز ہندی میں شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، المتوفی ۵۱۵ھ جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اور لاہور ہی میں رہتا تھا، اس نے ایک عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا دیوان یادگار چھوڑا۔

"یکے بتازی ویکے بہ پارسی ویکے بہ ہندی" (لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۴۶، گِب)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہ پڑا تھا، اس میں امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی فارسی ہندی میں علٰحدہ علٰحدہ بھی اور تینوں زبانوں کے مصرعوں کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھوں نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمے میں اس پر فخر کیا ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لئے ہیں۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (گوڑ بنگالہ کا ایک حصہ) گجراتی، تلنگی، معبری (کرناٹکی جس کو کنڑی کہتے ہیں) دہور سمندری (دھور سمندر کارومنڈل کا پایۂ تخت تھا جو اس زمانے میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی اور دہلوی۔

یہی زبانیں تھوڑے تھوڑے فرق سے اب بھی موجود ہیں، امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابوالفضل ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے؛[1]

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شال (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی اور کشمیری۔

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر زمانے میں صوبے وار بولیاں بولی جاتی تھیں اور ان میں کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا

---

[1] آئین اکبری جلد سوم "زبانہا" ص۱۲۵ نولکشور ۱۲

کرنے کے لئے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی ان [illegible] زبانوں کے اختلاف کا یہی حال رہا کہ ایک صوبے کا رہنے والا، دوسرے صوبے کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا، خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ملک جس میں کم از کم تیرہ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں، اس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیوں کر قرار دیا جا سکتا تھا، اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لئے ایک متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا اور اس کو ترقی دی۔

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی، جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکنی اور دہلوی ہیں، جن صوبوں کی بولیوں کو الگ وجود نہیں بخشا گیا ان میں بھی یہ اب تک ماننا پڑتا ہے کہ ان کی دو قسمیں ہیں ایک مسلمانی اور ایک خالص دیسی، چنانچہ بنگالی، مرہٹی کنڑی، تلنگی، ملیالم ہر ایک میں مسلمانی بولی خالص بولی سے الگ ہے۔ مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی خالص بنگالی، خالص مرہٹی اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے، یہ امتیاز یہی ہے کہ مسلمان ان صوبہ وار بولیوں میں عربی و فارسی لفظوں کو ملا کر بولتے ہیں اور ان صوبوں کے اصل باشندے اُن کو خالص اور بے میل بولتے ہیں۔

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی، مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا۔ سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا، اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔ سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والوں نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھا تھا۔

"برکت شیخ پٹھیا، اک مُوا، اک تھما"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا) مر گیا اور

دوسرا (سلطان فیروز شاہ تغلق) ناکام رہا۔

عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانے (۷۶۲ھ) میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں پیدا ہو چکا تھا۔ ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا [illegible] باہمی اختلاط و میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا تھا۔ اس زبان کی پیدائش کی اور پیدائش کی نہ سہی، تو اس کے قیام، بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمراں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ ناخواندہ اور عوام کے لئے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار میں کارآمد ہو اور بعینہٖ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے۔

اردو نام

زبانِ اردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے جو بیان سنایا تھا وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گزار راستہ بہت کچھ صاف ہوگیا ہے اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے اور آج سے پانچسو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہیں اور تیموری بادشاہوں سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں، اور اب چہار درویش کے مصنف میر امن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا .... جب

اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی
سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین
سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہجہان صاحب قران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا . . . . . .
تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا اگرچہ دلّی جدی ہے اور وہ پُرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو
اُردوے معلّٰی خطاب دیا۔"

لیکن میرے نزدیک ان چند سطروں میں اُردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سراپا حقیقت ہے، آج کل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اُردو" اور بعض اہل دکن نے "دکن میں اُردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اُردو" کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمدورفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام "اُردو" رکھا گیا ہے حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہئے، جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوتے۔

امیر خسرو اور ابوالفضل دونوں نے "دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہدِ شاہجہانی میں جب یہاں اُردوئے معلّٰی بنا تو اس "زبانِ دہلی" یا "زبانِ دہلوی" کا نام "زبانِ اردوئے معلّٰی" پڑ گیا، چنانچہ لفظ اُردو زبان کے معنی میں دہلی کے علاوہ کسی صوبے کی زبان پر اطلاق نہیں پایا ہے۔ میر تقی میر کی تحریری سند میں جب اس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے، تو اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے یعنی میر نے "اُردو زبان" نہیں کہا۔ بلکہ "اُردو کی زبان" کہا ہے۔

"ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبانِ اُردوے معلّٰی بادشاہِ ہندوستان" (ذکرِ میر ص۲۳)

بادشاہِ ہندوستان کے کیمپ یا پایۂ تخت کی زبان۔

اس کے بعد عام استعمال میں زبانِ اُردو کے بجائے خود زبان کا نام اُردو پڑ گیا اور پھر یہ اُردوئے معلّٰی سے نکل کر ملک میں ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی، جس اصول پر ہندوستان میں ہمیشہ راجدھانی کی بھاکھا تمام

حدودِ سلطنت میں پھیلتی رہی ہے۔

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطروں میں اس کو بار بار "نئی زبان" کہا ہے، مگر کیا حقیقت میں اس کو نئی زبان کہنا چاہیئے؟ ہم جس کو آج اُردو کہتے ہیں، حقیقت میں وہ دہلی اور اطرافِ دہلی کی وہ پرانی بولی ہے جو وہاں پہلے سے بولی جا رہی تھی اور جس میں زمانے کے قاعدے کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ اور خراد ہو ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔

ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم، فعل اور حرف۔ اس بولی میں جس کو اب اُردو کہنے لگے ہیں فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں۔ حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں، البتہ اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہیں اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہیں جن کے مسمّیٰ ان باہر کے ملکوں سے ہیں، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی) پادری، الماری وغیرہ،

اس لئے اُردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) میں صرف دو فرق ہیں، دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہ گئی، لیکن اسی ہندی میں اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ آکر ملے، جن کے معنی اور مسمّیٰ ان ملکوں سے آئے تھے،

دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط میں اور یہ اُردو فارسی خط میں لکھی جانے لگی۔

رفتہ رفتہ ایک اور فرق بھی پیدا ہوا کہ پُرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے زمانے اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان میں ہلکاپن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظوں میں بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیاں پیدا کیں۔

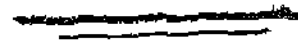
اُردو نے ہندی کے لفظوں میں اس قسم کا جو تغیر کیا ہے، اُس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

ہندی	اُردو	ہندی	اُردو
گنظر	گن	جیوہ	جی
براہمنر	برہمن	شکتی	سکت

ہندی	اردو	ہندی	اردو
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
ودوا	بیاہ	پونچا	پہنچا
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیوں کہ
ورش	برس (سال)	مائی	ماں
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سماں
اوچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندھی	سمدھی	لکھشن	لچھن
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
دیچار	بچار	اگنی	آگ
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلا مانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا سانچ	سچ
ورشارت	برسات	کٹمب	کٹم (خاندان)
وارتا	بات	اٹا	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانین	پانی
بادر	بادل	دوتے	دہی
دُگدھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھنت بھنت	بھانت بھانت

اب چوں کہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی اس لئے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رَل مل گئے، خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی کہیں یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کر کے بولنا شروع کیا، تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن دولت، رنگ روپ رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتا، داغ دھبا دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم کبھی فارسی لفظ میں ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے ہیں جیسے جن، مجور یا مزور یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)

ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہیئے کہ ان دونوں کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالیں جن کو دونوں نباہ لے جائیں۔



اُردُو پر اجمالی نظر

(نواب صدر یار جنگ بہادر)

ادب نواز حضرات! ذرّہ نوازی کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ ایک خاکسار کو بزمِ ادب میں یاد فرمایا صدر میں جگہ بخشی۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو۔ اُردو کے دو قدیم گہوارے، لاہور اور دکن۔ ناچیز کے انتخاب نے پرانے تعلقات تازہ کئے۔ حیدرآباد آج بھی ترقیِ اُردو کا مرجع ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے اُس کی عظمت کا سکّہ بٹھا دیا۔ یادش بخیر انجمن ترقیِ اُردو بھی وہیں پھلی پھولی اور یہ سب کچھ شہریارِ دکن خلّد اللہ ملکہ کے زیرِ سایہ ہو رہا ہے۔ لاہور نے بھی زمانۂ حال میں اُردو کی خدمت میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ رسالۂ مخزن نے جدید تعلیم یافتہ دماغوں کو ملکی ادب کی جانب مائل کیا۔ اقبال کا پرچمِ اقبال اُن میدانوں میں لہرایا جو قدیم ادیبوں کی دسترس سے باہر تھے۔

حضرات! جس مراسلے نے صدر نشینی کا مژدہ مجھ کو سنایا اُس میں یہ مشورہ بھی تھا کہ مجھ کو اختیار ہوگا کہ خطبۂ صدارت میں خواہ لسانیات سے بحث کروں یا ادبیات سے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ لسانیات کے فن میں خاکسار محض کورا ہے۔ حال میں بعض رسالے پڑھے، الفاظ کے جوڑ بند جس طرح اس فن میں جدا کئے جاتے ہیں اُس کو دیکھ کر نگاہوں میں یہ سماں پھر گیا کہ باغ میں ایک تازہ پھول دل فریب ہے۔ ہوا اور فضا دونوں اُس کے دم سے فیض یاب ہیں۔ نباتات کے ایک عالم تشریف فرما ہوں۔ پھول کو نگاہِ غور سے دیکھیں، چُنیں، پنکھڑیاں الگ الگ کریں۔ ہر پنکھڑی کو پھیر کر اُس کی رگیں شمار کریں۔ خلاصہ تحقیقات کا حق ادا فرمائیں۔ فن کو ترقی بخشیں۔ یہ جو کچھ ہوا بجا ہوا مگر پھول کی رعنائی پر تو چھری چل گئی۔ بعینہٖ یہی عالم لسانیات کے مباحث میں نظر آیا۔ جن الفاظ کی رعنائی غالب و آتش کے یہاں "کہنِ گل فروش" پر خندہ زن تھی اُن کو لسانیات کی قینچی کے نیچے اُسی طرح پارہ پارہ پایا جس طرح پھول عالمِ نباتات کی چٹکی میں تھا۔ حاشا اس بیان سے کسی فن کی شان میں گستاخی منظور نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اپنا اپنا ذوق ہے اپنا اپنا مقصود۔ عطّار کو گلاب کھینچ کر خوشی ہوئی کہ مریضوں کی خدمت کا سامان ہوا۔ مگر ایک جانِ سوختہ چلّا اُٹھا

گلوں کی کھینچ کے عطّار نے خراب کی بُو   کہاں وہ اُن کا پسینہ، کہاں گلاب کی بو

یہیں سے ہے کہ میں نے لسانیات پر ادبیات کو ترجیح دی۔

شرفائے ادیب! ادبیات کے سلسلے میں میرا مقصد یہ نہ ہوگا کہ اُردو ادب کا تفصیلی جائزہ لوں۔ اصنافِ ادب کی ترقی یا تنزل پر گفتگو کروں۔ اُن کے نمونے دکھاؤں۔ فرقِ مراتب ظاہر کروں۔ اس کے لئے طویل بحث درکار ہے اور وسیع وقت۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بحث بہت کچھ ہو بھی چکی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اُن بعض مباحث پر روشنی ڈالوں جو حال میں ظہور پزیر ہوئی ہیں۔ اور جنھوں نے ہماری زبان کی رفتار ترقی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اول تاریخِ اُردو پر اجمالی نظر مناسب ہوگی۔ اب تک عموماً اُردو زبان کا گہوارہ شاہ جہانی عہد قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ طلب مثلاً آثار الصنادید، تذکرۂ آب حیات، دریائے لطافت، جب یہ کتابیں لکھی گئیں تحقیقات کی حد یہی تھی۔ اب کہ مختلف کوششوں نے مزید راستہ صاف کیا تو دورِ شاہ جہانی سے بہت دُور سرحد نظر آنے لگی۔ چنانچہ مؤلف تذکرۂ گلِ رعنا نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اُردو زبان ہندوستان کی دیسی بولیوں اور بیرونی زبان کی آمیزش سے بنی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اور جہاں اول یہ میل جول ہوا ہے وہیں اور جب ہی اُردو زبان کی بنیاد پڑی۔ یہ دیکھنے سے قبل کہ بنیاد کا آغاز کب ہوا اور کہاں ہوا یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ کیوں کر ہوا تاکہ سبب اور مسبّب کی کڑیاں باہم مل جائیں۔

حضرات! عالم میں جو عظیم الشان تغیرات قدرت کے ہاتھوں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں وہ پیش خیمہ ہوتے ہیں بڑے بڑے انقلابوں کا۔ ملکوں اور قوموں کی نئی نئی زندگیوں کا۔ قسم قسم کی جدید حالتوں کا۔

برسات سے پہلے جو ہوائی طوفان مان سون کے نام سے سمندر میں برپا ہوتا ہے، وہ کیسی تازہ عظیم الشان زندگی دنیا کو بخشتا ہے۔ چٹیل میدان، ہرے بھرے کھیت بن جاتے ہیں۔ دریا موجیں مارتے ہیں۔ لُو کی زحمت راحت کی تازگی سے بدل جاتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

اسی طرح جو تاریخی تغیرات کرۂ زمین کے مختلف حصّوں میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں وہ انسانی زندگی میں بڑے بڑے انقلابوں کا باعث بنے ہیں حکومتوں کا نقشہ بدلا ہے۔ تہذیب و تمدّن کو آگے بڑھایا ہے،

علوم وفنون کو ترقی بخشی ہے۔ اسی سلسلے میں زبانیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ کبھی پیدا ہو کر بڑھی ہیں۔ کبھی مٹ کر فنا ہوئی ہیں۔ ایک بہت بڑا انقلاب جو تاریخی روشنی سے پہلے ہوا مگر لسانیات کو بزبان یاد ہے کہ وسط ایشیا سے آریا نسل کی نقل وحرکت کی صورت میں نمایاں ہوا۔ یورپ اور ایشیا کی زبانوں پر خصوصاً جو گہرے اثرات اس انقلاب کے ہوئے وہ اتنے وسیع اور دور رس تھے کہ کتابوں کی موٹی موٹی جلدوں میں بھی اُن کی تفصیل نہیں سماتی۔ زبان سے گزر کر وہ نقل وحرکت دنیا کے لئے بہت سے روحانی، سیاسی، معاشرتی وغیرہ انقلابات کا پیام تھی۔ ایک اور عظیم الشان انقلاب جو تاریخ کو خوب یاد ہے وہ تھا جو تقریباً آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے جزیرہ نمائے عرب کے تپتے ریگستانوں میں رونما ہوا۔ اُس انقلاب سے مجکو یہاں صرف اُسی حد تک بحث کرنی چاہیئے جس حد تک وہ ہماری زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے اول اُس انقلاب نے عربی زبان کو ایام جاہلیت کے محدود ادبی وخیالی دائرے سے نکال کر اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی، ملکی، علمی، اخلاقی، ادبی وغیرہ وغیرہ مطالب ومضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ عربی نے فارسی کو سنبھالا، توحید سے آشنا کیا، تاریخ نگاری کا سلیقہ بخشا، تصوّف سکھایا۔ ادب کا پایہ اتنا بلند کیا کہ فردوسی وسعدی آفتاب وماہتاب بن کر نور افشاں ہوئے۔ یہی وہ دو آتشہ مئے ناب تھی جس نے ہمارے ملک ہندوستان میں بزم افروز ہو کر دیسی زبانوں کے رگ وریشہ میں گرمی حیات پیدا کی۔ اندرونی اور بیرونی بولیوں کا سب سے پہلا سنگم سندھ کا ملک ہے جہاں ۹۲ھ؁ ۷۱۱ء میں عرب آئے۔ اُن کی زبان عربی تھی اس لئے اسی زبان کا رواج اُن کے عہد میں ہوا اور سندھی کے دوش بدوش زبانوں پر رواں ہوئی۔ ابن حوقل نے پانچویں صدی ہجری میں عربی اور سندھی دونوں کو سندھ میں رائج پایا۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ المسالک والممالک میں کہتا ہے:

"ولسان اهل المنصورة والملتان ونواحيها العربية والسندية ولسان اهل المكران الفارسية والمكرانية"	(ترجمہ) منصورہ اور ملتان اور ان کے اطراف والوں کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ اور مکران والوں کی فارسی اور مکرانی۔

(دیکھو صفحہ ۳۳۲ چھاپہ لیڈن ۱۸۸۲ء)

ظاہر ہے کہ اس میل جول کا اثر سندھی زبان پر ہوا ہوگا اور غالب ہوا ہوگا۔ اس اثر میں قوت اس اُنس اور ربط نے بخشی ہوگی جو عربوں اور سندھیوں کے درمیان اس عرصے میں پیدا ہوگیا تھا اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کی وفات پر کیرج والوں نے اس کا بت بنا کر پرستش کی۔ شاعروں نے مرثیے لکھے[1]۔ یہی اثر اردو زبان کا سنگ بنیاد بے خدشہ قرار پا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تحقیق کا قدم سندھ تک نہیں پہونچا۔ اس عہد کی نوپیدا سندھی زبان کے نمونے ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی۔ اہل نظر کی تلاش و فکر کا یہ میدان ہنوز منتظر ہے۔

سندھ کے بعد پنجاب کا دور تھا۔ اِن دونوں دوروں کا مقام اجتماع قدرتی طور پر ملتان تھا۔ ظاہر ہے کہ دوسرا دور نئی زبان ہندی کا بھی یہیں شروع ہوا ہوگا۔ اگرچہ یہ دور بھی تشنۂ تحقیق ہے۔ تاہم ہم کو ممنون اور شکر گزار ہونا چاہیئے پروفیسر محمود شیرانی کی جاں فشاں تحقیق کا جنھوں نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر تحقیقات کو وسعت بخشی اور بتایا کہ پنجاب نے اپنے دور میں کیا کیا خدمتیں اردو کی کی تھیں۔ اس جدید تحقیق سے ایک نیا باب تاریخ اردو میں اضافہ ہوا۔ پنجاب سے سلطنت دلّی میں منتقل ہوئی۔ غلاموں سے لے کر مغلوں کے عہد تک اکثر دلّی ہی دارالسلطنت رہی۔ اس طویل زمانے میں نئی ہندی زبان کی پرورش وہیں ہوتی رہی۔ افسوس ہے کہ وہاں کے نشو و نما کے بھی اکثر دور پردۂ تاریکی میں ہیں۔ کاش علمی روشنی ان پردوں کو بھی چاک کر دے۔ اس افق پر سب سے اوّل کوکبۂ خسروی بلند ہوتا ہے۔ اُن کے کلام کے جو نمونے دستیاب ہو سکے ہیں وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں ہندی زبان خاصی ترقی کر کے دوسری زبانوں سے نمایاں امتیازی خصوصیت حاصل کر چکی تھی۔ نمونۂ کلام ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارہ — کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا[2]

---

[1] تاریخ ہند سید ہاشمی شائع کردہ جامع عثمانیہ ص۱۵۱ و تاریخ سندھ مؤلفہ عبدالحلیم شرر ۱۲

[2] "پنجاب میں اردو" و "تاریخ اردو قدیم" ۱۲

یہی زمانہ ہے کہ علاء الدین خلجی نے انتہائے دکن تک اپنی سلطنت کا دائرہ وسیع کیا۔ یہ سیاسی اثر کی وسعت ہندی زبان کی مزید وسعت کا سبب تھی۔ خلجی کے بعد محمد شاہ تغلق نے دکن کا رُخ کیا۔ دیوگیر کو لے کر دولت آباد بنایا اور دلی دولت آباد میں جا بسائی۔ دلی والے اپنی زبان بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ آخر اور دکن کا یہ سیاسی تعلق بہت ہی جلد ٹوٹ گیا۔ خود محمد تغلق ہی کے عہد میں علاؤالدین نے بہمنی سلطنت کی بنیاد جمادی۔ سیاسی تعلق کے ساتھ ساتھ دکنی ہندی کا رشتہ شمالی ہندی سے منقطع ہوگیا اور دکنی ہندی نے اپنی دکنی بہنوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کی۔ اس وقت جو ذوق اُردو ادب کی خدمت کا حیدرآباد دکن میں پیدا ہوگیا ہے اُس کے اثر سے بہت سی کتابیں قدیم ہندی کی دستیاب ہو چکی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی تصنیف اِسی دورِ بہمنی کی ہے اور وہ معراج العاشقین ہے جو نویں صدی ہجری کی تصنیف ہے یعنی آج سے پانچسو برس پہلے کی اور جس کی نسبت قوی شہادت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہونے کی پائی جاتی ہے۔ نمونہ اُس کا یہ ہے:-

"یعنی واجب کے آنک سوں غیر نہ دیکھنا سوں۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سُننا سوں۔ حسد نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جا کا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پچھان کر دوا دینا۔"[1]

عہد بہمنیہ سے لے کر عادل شاہی اور قطب شاہی عہد تک دکنی ہندی برابر ترقی کرتی رہی۔ سب سے اوّل نثر رائج ہوئی۔ اس کے بعد نظم۔

نظم میں سب سے پہلی کتابیں دسویں گیارہویں صدی ہجری کی دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی "گلشنِ ہند" ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۶۸ھ میں تمام ہوئی ع

"مبارک ہے یو ہدیۂ نصرتی"

تاریخ تصنیف ہے۔ ڈی ٹاسی نے اگرچہ نصرتی کو برہمن لکھ دیا ہے تاہم واقعہ ہے کہ وہ پشتینی مسلمان تھا اور سپاہی زادہ۔ چنانچہ خود لکھتا ہے:-

---

[1] معراج العاشقین ص۱ مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن ۱۲

بحمداللہ کرُسی بکرُسی مری — چلی آرہی ہیں بندگی میں تری

یہ شعر خواجہ بندہ نواز کی منقبت میں ہے۔ نمونۂ کلام[1]

غریباں نوازندہ اے بے نیاز — یہ عاجز کی سُن عرض کر سرفراز
کہ عاجز ہوں ہو عاجزی پر شفیق — ہدایت کوں توفیق مجھ دے رفیق
نہ موجود ہونے کے مختار تھے — نہ اس زندگی کے ہوس دار تھے
مُنجے مست کر دے محبّت کا جام — کہ دنیا کا غم دل سے بسرروں تمام (مناجات گلشنِ عشق)

خود دکن کی مختلف سلطنتوں کے فرماں فرما ہندی میں صاحبِ تصنیف ہوئے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اُن کے شوق و قدردانی نے ہندی کی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں برق و باد کا کام دیا۔ قطب شاہیوں میں سلطان محمد قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ صاحب کُلیات تھا۔ اُس کی کلیات کا ضخیم نسخہ (جو قطب شاہی خاندان کے شاہی کتاب خانہ کا ہے) حیدرآباد میں موجود ہے۔ عادل شاہیوں میں علی عادل شاہ بھی (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) ہندی کا شاعر تھا۔ اس دَور میں دکن تو ہندی زبان کی وہ خدمت کر رہا تھا جس کا مجمل بیان اوپر ہوا۔ لیکن (جہاں تک علم ہوا ہے) شمالی ہند فارسی ادب کے ذوق میں سرشار تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جس کثرت سے ایران کے اہلِ کمال دلّی میں آئے دکن نہ پہنچ سکے۔ اس کا سبب دربارِ دہلی کی قوی کشش اور قدردانی تھی۔ معہذا بمقابلہ دکن کے دلّی پہونچنا آسان بھی تھا۔ یہ مانا کہ "خاکِ پاک" بےجاپور کو ملک قمی اور ظہوری پر ناز ہے اور بجا ناز ہے۔ لیکن دلّی کا سرمایۂ ناز اس سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

یہ دَور ختم ہوا تو اُتّر دکن ایک ہو گئے۔ شہنشاہ عالمگیر نے اورنگ آباد کو دارالسلطنت بنایا۔ اس طرح اورنگ آباد ہی شمالی اور دکنی اہلِ کمال کا مرجع بن گیا۔ اس جامعیت نے اُردو کی نشو و نما میں ابرِ بہاری کی تاثیر دکھائی۔ اورنگ آباد اور نواح اورنگ آباد کی زبان اب تک بمقابلہ دکن کے دوسرے حصّوں کے دلّی کی زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اورنگ آباد ہی کو یہ فخر ہے کہ اُس کی خاک سے ولی دکنی اٹھا جس کی نظم کے سامنے ہم عصر فارسی کلام کا رنگ ماند پڑ گیا اور اُردو شاعری نے فارسی کی جگہ لے لی۔ اس کے کیا اسباب ہوئے؟ یہاں اس کی

[1] ملاحظہ ہو رسالۂ اُردو جنوری ۱۹۲۲ء

بحث دلچسپ ہوگی۔ مغلوں نے جو قوّت اور دست گاہ فنونِ لطیفہ کی تربیت و پرورش کی فیاضِ ازل کی بارگاہ سے پائی تھی، اُس میں اب تک وہ فرد ہیں۔ اِسی تربیت کے اثر سے فارسی تغزل میں وہ لطف و رنگینی پیدا ہوئی کہ خود ایران اُس کے پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ جو اہلِ کمال ایران سے ہندوستان میں آکر فیض یاب ہوئے مثلاً عرفی و نظیری۔ اُن کے لطفِ کلام کو اُن کے وہ ایرانی معاصر نہ پا سکے جو ایران ہی میں رہے۔ مثلاً محتشم کاشی جس کی بے نمکی کی شکایت شیخ علی حزیں نے لکھی ہے۔ یہ تحقیق ہے کہ عرفی و نظیری، ہندوستان آکر خان خاناں اور ابوالفتح کی صحبت میں عرفی و نظیری بنے (ملاحظہ ہو دیباچۂ کلّیاتِ عرفی) بہرحال یہ دل آویز ہوش رُبا رنگ جہانگیر کے عہد تک قائم رہا اور یہ وہ رنگ تھا جس کی نسبت ع

"وراے شاعری چیزے دگر ہست"

کہا گیا ہے۔ طالب آملی اس دَور کا خاتمۃ الباب تھا۔

شاہ جہانی دَور کے شعرا نے متانتِ کلام اور مثالیہ شاعری سے میدان روکا۔ کلیم اور قدسی کے دیوان شاہد ہیں۔ یہ انداز اُن پر ختم ہوگیا۔ عہدِ عالم گیری کے لئے یہ بھی باقی نہ رہا۔ محض قافیہ پیمائی رہ گئی۔ ایک شاعری پر کیا منحصر ہے، سارے فنونِ لطیفہ پر پانی پھر گیا۔ بہرحال شاعری رہی "وراے شاعری چیزے دگر" رخصت ہوگئی۔ اس بد مذاقی کی حد جعفر زٹلی کے کلام سے جا ملی۔ جو بیّن ثبوت اس امر کا ہے کہ متین کلام میں گرمیِ سخن باقی نہ رہی تھی اور وہ ضیافتِ طبع کا سامان بہم پہونچانے سے عاجز ہو چکا تھا۔ ہندوستان پر کیا انحصار ہے جب ایران میں صفویہ سلاطین کا ادب آموز دربار نہ رہا سنّاٹا ہوگیا۔ وہاں بھی حزیں کے بعد قاآنی کو الگ کر لو تو مشاعرے ویران نظر آئیں گے۔ نہ تیموری و صفوی رہے نہ پھر کمال پروان چڑھا۔ غرض فطرتِ انسانی ذوقِ ادب کی جویا تھی۔ ہندیوں کا فارسی کلام اس میدان میں سپر ڈال چکا تھا۔ ہندی شاعری قدم بڑھا رہی تھی۔ یہی وقت تھا کہ ولی دکنی دلّی پہونچے۔ جہاں فارسی بے زبان تھی، وہاں اُن کی بھاشا کون سُنتا۔ اُن کی کس مپرسی دیکھ کر ایک اہلِ دل نے اُن کو یہ نکتہ بتایا کہ آتشِ پارسی سے اپنے کلام کو گرماؤ تو اہلِ مذاق کی آتشِ شوق کو بھڑکا سکو گے ولی نے اس نکتہ کو سُن کر اپنے کلام کا انداز بدل دیا۔ یہ پہلا قدم تھا اُس وادیِ جنون کی طرف جس کے مجنوں میر، مرزا اور غالب و ذوق بنے۔ اس انداز نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی اردو شاعری کو مقبولِ عام

بنا دیا۔ پنجاب کا رنگ بدل جاتا ہے[۱] دکن میں بادِ شمالی چلنے لگتی ہے۔ بالاجی نانک ذرّہ تخلص اورنگ آبادی (معاصر میر غلام علی آزاد کی) ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ طلب ہے

میں غبارِ رہِ دلدار ہوں اللہ اللہ — خاکِ نقشِ قدمِ یار ہوں اللہ اللہ

کیوں نہ جانا فے میں خجلت سے چھپے مشکِ ختن — نکہتِ طرّۂ خمدار ہوں اللہ اللہ

رشک سے کیوں نہ دلِ طور تجلّی سے جلے — سُرمۂ نرگسِ بیمار ہوں اللہ اللہ

دارِ مژگاں پہ جوں منصور انا الحق گویاں — شیشۂ اشک پری وار ہوں اللہ اللہ

میں شہیدِ نگہِ یار ہوں اللہ اللہ — بسملِ خنجرِ دلدار ہوں اللہ اللہ

تپ ہجرت سے بن موہیں رہا ہیں نم خوں — تشنۂ شربتِ دیدار ہوں اللہ اللہ

رخ و رخسار کا عاشق ہوں ہمیشہ سیتی — زلفِ مشکیں کا میں ہار ہوں اللہ اللہ

ذرّہ خورشید لقا سیتی ہوا ہوں گلزار

سر ہوں ور گل گلزار ہوں اللہ اللہ

دیگر

مت آیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی — جس طرح گئے روز گزر جائے گی شب بھی[۲]

حاصل کلام اس ذوق نے اردو نظم کو وہ ترقی دی کہ مرزا غالب کی نازک دماغی نے بھی (جو ہندوستان کے تمام شعراء فارسی کے باستثنا امیر خسرو منکر ہیں) اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو چیز "ورائے شاعری" ہے وہ فارسی گو ہندیوں کے یہاں معدوم ہے۔ لیکن ہندی گویوں کے یہاں ہے۔ چنانچہ چند شعر اس کے ثبوت میں لکھے ہیں جن میں ایک شعر مومن کا بھی ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس دور کے ختم ہوتے ہوتے زمانے نے پلٹا کھایا۔ تیموری تخت پر شکست آئی۔ طوائف الملوکی کی آندھیاں چلنے لگیں۔ باغِ ادب کی بلبلیں پریشان ہوئیں جس طرح آندھیاں بہت سے بیج ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ

---

[۱] پنجاب میں اردو ص ۱۶۵ [۲] دیوان ہندی بالاجی نانک متخلص بذرّہ کتاب خانہ آصفیہ نمبر ۹۵۳۔

ڈال دیتی ہیں۔ اور وہاں گلزار کھل جاتے ہیں، حوادث کی ان آندھیوں نے یہی سلوک ادب اُردو کے ساتھ کیا۔
اُردو کے اہلِ کمال پریشان ہوکر دلّی سے نکلے تو مرشدآباد سے دکن تک پھیل گئے۔ لکھنؤ، فرخ آباد، ٹانڈہ، رامپور،
پٹنہ، مرشدآباد، حیدرآباد، کرناٹک، میسور۔ ہر جگہ ان اُستادوں کے دم قدم سے بزمِ ادب آراستہ ہوگئی۔ وہ
خود تو برباد ہوئے، مگر ادب کی انجمن آباد کر گئے۔ اہم واقعہ یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں اُردو آسام میں بھی رائج ہوگئی
حالانکہ انگریزی عملداری سے پہلے وہاں سیاسی خارجی اثر بہت کم کامیاب ہو سکا تھا[1]۔ بیشتر کا حصّہ لکھنؤ نے پایا۔
لکھنؤ کا امن، دلّی سے قرب، سب سے زیادہ مجمع اہلِ کمال کا یہیں ہوا۔ سونے میں سہاگہ وہ تہذیب جو فرماں روایانِ
اودھ اور شرفائے اودھ کی متفقہ کوشش سے پیدا ہوئی۔

اِن اسباب نے ادب میں لکھنؤ کو دلّی کا حریف بنا دیا۔ اس پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اگلے اُستادوں نے
خدمتِ فن کس طرح فرمائی اوّل تو کاہش اور جاں بازی سے خود اپنی تربیت کرکے اُستادی کے مرتبے تک پہونچے۔
صاحبِ طرز ہوئے۔ تاثیرِ کلام سے دلوں کو مسخر کیا۔ شاگردوں کی تربیت کی اور اپنے طرزِ خاص کو رائج کیا۔
بڑا کمال یہ کہ کسی حال میں رہے (خوش حال یا بد حال) خدمتِ فن کا اہتمام جان کے ساتھ رہا۔ انہی بزرگوں کی
کوشش سے نظمِ اُردو نے وہ مرتبہ پایا کہ اپنی مقبولیت اور کامیابی پر اُس کو بجا ناز تھا۔ نثر ہنوز سرپرستی سے
محروم تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کا سامان بھی بہم پہونچ گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزی سلطنت کے استحکام
اور وسعت نے کاروباری زندگی کو تازہ کیا۔ آئین کی مضبوطی نے نظامِ سلطنت کو ازسرِ نو فروغ بخشا۔ ضرورت ہوئی
کہ دماغ خیالی میدانوں سے نکل کر عملی زندگی کی فضائیں جوہر دکھائیں۔ ایک جانب یہ تھا۔ دوسری جانب حکومت
کی ضرورتیں نئے حکّام کو ملکی زبانوں کے سیکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

تدریجی رفتار دیکھو۔ ابتداءً جب کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی کے اختیارات حاصل کئے تو علمی و عدالتی زبان
عربی تھی۔ عدالتی اس لحاظ سے کہ فیصلوں کا مدار عربی فقہ کی کتابوں پر تھا۔ اس ضرورت سے اوّل کمپنی نے عربی
کی خدمت کی۔ ایک مدرسہ کلکتے میں دوسرا مدراس میں قائم ہوا۔ قاضی القضاۃ، صدر الصدور، منصف و مفتی
بڑے بڑے علمائے وقت ہوتے تھے مفتی صدرالدین خاں، مولانا فضل امام، قاضی القضاۃ ارتضیٰ علی خاں کے نام

---

[1] Islamic Culture of Hyderabad, July 1928 P. 342.

مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں، اس کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لی، ہدایہ وغیرہ فقہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا تعزیرات فارسی میں مدوّن ہوئیں۔ اُس زمانے کے انگریز حکام فارسی کے کیسے ماہر ہوتے تھے اس کے اندازے کے لئے یہ دلچسپ واقعہ سنو۔ ایک فوجداری کے مقدمے میں گواہ اظہار دے رہا تھا۔ سرشتہ دار لکھ رہا تھا آلۂ ضرب کی موٹائی کے سوال میں گواہ نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا کلمے کی اُنگلی سے ملا کر بتایا کہ لکڑی اس قدر موٹی تھی۔ سرشتہ دار کا قلم رُک گیا اور سوچنے لگا کہ کیا لکھوں۔ یورپین حاکم نے فوراً کہا "لکھو، نر انگشت را بابا بہ ضم کردہ سطبری چوب نمود"

اس دَور کے بعد اُردو کا دَور تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم میں ادب اُردو کی ترقی و تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ ترجمہ اور تالیف کے ذریعے سے نثر کی اکثر نظم کی کمتر کتابیں تیار کرائی گئیں۔ مشہور روزگار ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس کے مہتمم تھے۔ ان کتابوں کی تیاری سے زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ ملکی و جنگی انگریز حکام اُن کو پڑھ کر امتحان دیں اور ہندوستانیوں کی باتیں سمجھیں۔ اس کے بعد انگریزی کے لئے میدان صاف تھا یہاں یہ تذکرہ دلچسپ ہو گا کہ اُردو ادب نے دو قلعوں میں تربیت پائی۔ ایک دلّی کا قلعۂ معلّٰی دوسرا کلکتے کا فورٹ ولیم قلعۂ معلّٰی میں شاہ عالم ثانی سے لے کر ابو ظفر بہادر شاہ کے عہد تک کا زمانہ نیستی و بربادی کا زمانہ تھا۔ سلطنت برائے نام بھی بلکہ بدنام تھی۔ تاہم تیموریوں کا ذوق ادب اس حال میں بھی کارفرما رہا۔ قلعۂ معلّٰی کی زبان اُردوئے معلّٰی ٹھہری اور کمال کے لئے ٹکسال۔ میر تقی میر لکھتے ہیں:

"ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّٰی بادشاہ ہندوستان"[1]

فیض تربیت یہ تھا کہ غالب و ذوق سے اساتذہ اُسی صحبت میں بنے۔ آخر میں داغ دہلوی نے نام پایا۔

فورٹ ولیم کی تربیت نے میر امن، سید حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس وغیرہ وغیرہ سے نثر اُردو کی قابل قدر بہت سی کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔ تاہم وہاں کے فیض تربیت سے میر امن یا افسوس بھی نہ بن سکے۔ یہ بیان تشنۂ کمال رہے گا اگر اُس کوشش ادبی کا ذکر نہ کیا جائے جو سرسید اور اُن کے قابل رفقا نے ایک تیسرے قلعہ علی گڑھ کے زیر سایہ کی۔ سرسید کے قلم نے اُردو زبان کو علمی، اخلاقی، سیاسی، ادبی۔ غرض گوناگوں زندہ مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے ترجمے کے ذریعے سے علم و فن کے مستند سرمایہ سے

---

[1] ذکر میر ص ۶۷

گراں بار فرمایا۔ یادش بخیر اسی صحبتِ علی کے فیض سے خواجہ حالی مرحوم نے اُردو شاعری کو جدید طرز سے آشنا کیا اور مسدس حالی لکھ کر سرسید کی کوشش کو گراں بہا مدد پہونچائی۔

دہلی و لکھنو

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ دلّی کی بربادی کے بعد ادب اُردو کی خدمت کا سہرا لکھنو کے سر پہ بندھا اور ارباب ذوق نے وہ خدمت کی کہ لکھنو زبان کی دوسری ٹکسال قرار پایا۔[1]

حریفوں نے دلّی اور لکھنو کو باہم خوب لڑایا ہے۔ اور بڑے بڑے معرکے گرم کئے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مرکزِ ادب گویا ان معرکوں سے بے خبر اپنے اپنے طرز پہ خدمتِ ادب میں سرگرم رہے ہیں اور ایک دوسرے پر برابر اثر ڈالتا رہا ہے۔

لکھنو نے تہذیب زبان میں زیادہ حصہ لیا ہے تو دلّی نے تخیلِ شعر کا علم بلند رکھا ہے۔ تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو

لکھنو میں پہلا دور تو شعرا دہلی کا تھا جن میں میر و مرزا ممتاز ہیں۔ ناسخ نے علمِ استقلال بلند کیا اور زبان کی اصلاح کی ان کے بعد ہی مومن دہلوی کی یادگار نسیم دہلوی لکھنو پہونچے، بزم اُستادی آراستہ کی ناسخ نے جو اصلاحِ زبان کی تھی اُس کو قبول کیا ساتھ ہی دہلوی تخیل کو قائم رکھا۔ میر حسن کے خاندان نے اپنی خاندانی خصوصیاتِ ادبی کو برابر قائم رکھا۔ اُن کے پوتے میر انیس اپنے مخصوص محاوروں کی بابت فرماتے "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنو اس طرح نہیں فرماتے"[2] یہیں سے انیس و دبیر کے کلام کا فرق سمجھ سکتے ہو۔ ذرا اس پر غور کرو کہ ناسخ کے حریف آتش، دہلوی نژاد تھے۔ شاید یہی فرق ہے کہ "ورائے شاعری چیزے دگر" کی شرح میں غالب لکھتے ہیں:

"ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"[3]

سلطنت لکھنو کی تباہی پر نواب خلد آشیاں کے زیر سایہ رامپور میں بزم ادب آراستہ ہوئی۔ دہلی و لکھنو کے اربابِ فن جمع ہوئے۔ اساتذۂ لکھنو میں سے، اسیر، منیر، بحر، امیر، جلال وغیرہ جلوہ فرما ہوئے۔ دلّی کا نام داغ نے روشن کیا۔ اس اجتماع سے پھر ایک کا اثر دوسرے پر ہوا۔ ان مشاعروں نے اسیر جیسے پُرانے اُستاد کے اندازِ کلام کو بھی اچھوتا نہ چھوڑا۔ امیر و جلال کا تو انداز ہی بدل گیا۔ دونوں اُستادوں کا اوّل و آخر کلام مقابلہ کر کے پڑھو تو

---

[1] دیکھو دیباچۂ امیر اللغات ۱۲ [2] آبِ حیات ذکر میر انیس مرحوم ۱۲ [3] تذکرۂ گل رعنا حال آتش ۱۲

یہ فرق صاف نظر آئے گا۔ آج لکھنؤ میں کلام غالبؔ کا جو ذوق ہے وہ عیاں ہے، بیان کی حاجت نہیں۔ اس ربط کا دلگیر سماں یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی اُستادی کے آخری علم بردار داغؔ و امیرؔ حیدرآباد کی ایک نامور درگاہ میں پہلو بہ پہلو آرام فرما ہیں۔

ہماری زبان کے نام

یہ بحث اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس لئے اُس کا بیان میں نے ضروری خیال کیا۔

(۱) ہندی آج جو زبان اُردو کے نام سے مشہور ہے اُس کا اصلی اور مقبولِ عام قدیم نام "ہندی" ہے یعنی جو زبان دیسی اور پردیسی زبانوں کے اختلاط و ربط سے ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ اُس کا نام ہندی قرار پایا۔ اور عہد قدیم سے لے کر اب سے کچھ زمانہ پیشتر تک اُس کا یہی نام رہا۔ ذیل کی شہادتیں اس مدعا کو ثابت کرینگی:۔

(۱) شیخ سعدی شیرازی نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں ترکی، گازرونی، تازی، کاشی، قزوینی، شیرازی وغیرہ زبانوں میں اشعار لکھے ہیں اُس کا مطلع یہ ہے ؎

دلبرے دارم نکو مانندۂ شمس و قمر — دلربائے جاں فزائے قندخائے چوں شکر

اسی "دلبر" کی زبان سے مذکورۂ بالا زبانوں کے اشعار سنوائے ہیں۔ اُس میں ایک شعر ہندی بھی ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے ؎

گہ بہندی گویدم پانی ہمن روٹی کہن[1]

(۲) ترجمہ شمائل الاتقیا (جو ۱۱۰۰ھ میں دکن میں ترجمہ ہوئی) "اپنی حیات کے مُنجہ اشارت کئے تھے جو شمائل الاتقیا کتاب کو ہندی زبان میں لیا وے[2]"

(۳) ترجمہ معرفت السلوک "کتاب معرفت السلوک جو تصنیف مغفرت پناہی ہور شیخ الشیوخ ...... ہے فارسی زبانوں اُسے ہندی زبانوں بیان کر[3]"

(۴) شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ زاد المتقین الی سلوک الدین مؤلفہ ۱۰۱۱ھ میں فرماتے ہیں: "و ہندیاں در تقریر فارسی تکلف نکنند و ہم بزبانِ ہندی اکتفا فرمایند[4]"

---

[1] کلیاتِ سعدی نسخہ مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۶ھ ص ۱۷ [2] دیباچہ ترجمہ شمائل الاتقیا، نسخہ کتاب خانہ آصفیہ [3] ترجمہ معرفت السلوک نسخہ کتاب خانہ آصفیہ [4] اردوئے قدیم حکیم شمس اللہ قادری

(۵) ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر دہلوی: "اس واسطے اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان ویسے ہی اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کریئے۔ الحمدللہ والمنۃ کہ ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا ..... دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"[۵۱]

میر تقی میر نے نکات الشعراء میں زبان اردو کو ہندی لکھا ہے۔ چنانچہ آگے آتا ہے۔ انشاء اللہ خاں کے زمانہ میں اگرچہ اردو کا لفظ رائج ہو چلا تھا تاہم وہ اس زبان کے لئے ہندی کا لفظ بھی استعمال کرتے جاتے ہیں۔ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں: "دریں عبارت ہندی 'کل ہم تمہارے یہاں گئے تھے' ..... دیگر 'لو' کہ ہندی بجائے 'بگیر' مستعمل ست" علی ہذا القیاس۔ اخیر زمانے تک بھی یہ نام باقی رہا۔ چنانچہ جان گلگرسٹ نے جو بیاض اردو شعراء کے منتخب کلام کی جمع کی تھی اس کا نام "بیاض ہندی" رکھا اور ایک اور اردو کتاب کا نام "اتالیق ہندی"[۵۲]

مرزا غالب کے خطوط کے ایک مجموعے کا نام "اردوئے معلّٰی" ہے تو دوسرے کا نام "عود ہندی" یہی وجہ ہے کہ زبان ہندی (اردو) کو ملکی دوسری دیسی زبانوں سے ممتاز کرنے کے لئے ایک اور لفظ "ہندوی" رائج تھا۔

آٹھویں صدی ہجری کی ایک لغت کی کتاب ہے "بحر الفضائل فی منافع الافاضل" اس میں عربی، فارسی، ترکی کے ان الفاظ کے معنی دیسی زبان میں بھی بتائے ہیں جو اساتذہ و شعرائے فارسی کے کلام میں رائج تھے صدہا جگہ دیسی زبان کے لئے "ہندوی" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خردل ..... ہندوی رائی گویند، خرس ..... در ہندوی ریچھ گویند، علیٰ ہذا القیاس۔[۵۳]

فرشتہ اپنی تاریخ میں ابراہیم عادل شاہ کے ذکر میں لکھتا ہے "دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد" محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں راجہ ایامل نے عالمگیر کے رقعات مرتب کرا کر "دستور العمل آگہی" نام رکھا

---

[۵۱] مقدمہ ترجمہ قرآن شاہ صاحب ممدوح مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۲۹۲ھ ۱۲ [۵۲] ارباب نثر اردو ص ۱۹ و ۲۰۔

[۵۳] بحر الفضائل مؤلفہ محمد بن قوام بلخی نسخہ کتاب خانہ آصفیہ۔

۱۰۶۳ھ میں یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ اُس میں ایک قصے کی تمہید ہے " درایامیکہ شجاع بدفعہ اوّل درمقابلۂ عالم گیر بادشاہ ہزیمت خوردہ فرار نمود ...... و از اتفاقات دراں ایام نوشتہ خط ہندوی اعلیٰ حضرت کہ بنام شجاع فرستادہ بدست آمدہ بود" اور رقعۂ مذکور کی عبارت یہ ہے " عرضی ...... از سبب گرفت وگیر خطوط استفسار شدہ بود ...... چنانچہ از نوشتہ کہ بخط ہندوی بشجاع قلمی گردیدہ بود"

(۲) **ریختہ** یہ نام بمقابلہ " ہندی " کے بہت جدید ہے۔ اور بظاہر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں بارہویں صدی ہجری کے وسط میں رائج ہوا۔ ولی دکنی کا شعر ہے ؎

" یہ ریختہ ولی کا جاکر اُسے سنادو
رکھتا ہے فکرِ روشن جو انوری کی مانند"

یہ لحاظ رہے کہ ریختہ دراصل نظم اُردو کا نام تھا۔ اور زیادہ تر اُسی زبان کے لئے استعمال ہوا جو نظم کی یا شعر کی تھی، زیادہ عام کہو تو فصحا کی۔ چنانچہ میر تقی میر نکات الشعراء کے خاتمے میں لکھتے ہیں: "بداں کہ ریختہ برچندیں قسم ست" اس کے بعد یہ چھ قسمیں لکھی ہیں:

(۱) ایک مصرعہ فارسی دوسرا ہندی (۲) نصف مصرعہ ہندی اور نصف فارسی
(۳) حرف وفعل فارسی استعمال کریں (۴) فارسی ترکیبیں مستعمل ہوں۔
(۵) ایہام (۶) انداز جو میر صاحب کا مختار ہے جس میں ادا بندی فصاحت وبلاغت شامل ہے۔

محمد قیام الدین قائم۔ اپنے تذکرۂ مخزنِ نکات میں کہتے ہیں کہ: " ذکرو بیان اشعار واحوال شعرائے ریختہ"
شاہ عبدالقادر صاحب کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی وہ بھی یہ امتیاز ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعرے کے مقابل میں (جو اُس عہد میں فارسی کلام کے لئے ہوتا تھا) " مراختہ " کا لفظ ایجاد ہوا۔ حاکم لاہوری اپنے تذکرہ " مردم دیدہ " میں خانِ آرزو کے حال میں لکھتے ہیں: " مراختہ درخانۂ خان آرزو پانزدہم ہرماہے می شد" خواجہ میر دردؔ کے حال میں لکھا ہے " باشعر ربط بسیار دارد سیما ریختہ کہ الحال در ہندوستان رواج دارد"

(۳) **اُردو** سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ ترکی ہے لشکر کے معنی ہیں ابتداءً مغل اور ترک بادشاہ لشکر ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے دربار وسراپردہ بھی لشکر ہی میں ہوتا تھا۔ اس امتیاز خاص سے شاہی لشکر

"اُردوے معلّٰی" کہلایا اور بارگاہ و سراپردہ کا نام "اُردوے معلّٰی" ہوا۔ یہ تو عام بات ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ لفظ ہماری زبان کے لئے بجائے "ہندی" اور "ریختہ" کے کب سے رائج ہوا۔ جن مورخین اُردو نے عہدِ شاہجہانی کو اُردو کی نشوونما کا عہد قرار دیا ہے وہ شاہجہاں کے اُردوے معلّٰی کی مناسبت سے اس کا نام اُردو رکھا جانا تجویز فرماتے ہیں[۱]۔ مگر اس کی کوئی سند نہیں کہ عہد مذکور میں اس زبان کا نام اُردو تھا۔ انتہا یہ کہ دلّی کے اُردو بازار کا نام بھی اُس عہد میں یہ نہ تھا[۲]۔ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے کہ ابتدا سے آخر تک ہماری زبان کا نام ہندی رہا۔ جب ولی دکنی نے مضامین فارسی کی چاشنی ہندی نظم میں پیدا کی تو خاص ادبی و شعری زبان کو ریختہ کہنے لگے۔ اُس وقت تک بھی اُردو کا لفظ اس زبان کے لئے مستعمل نہ ہوا تھا چنانچہ میر تقی میرؔ، میر حسن دہلوی، قیام الدین قائمؔ نے اپنے اپنے تذکروں میں کلام اُردو کے لئے ریختہ ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُردو کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ ذکر میر اور تذکرہ نکات الشعراء میں میر صاحب لکھتے ہیں:- "درفنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبانِ اُردوئے معلّٰی شاہجہاں آباد دہلی" (دیباچہ نکات الشعراء)

"ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّٰی بادشاہ ہندوستان" (ذکر میر)

کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ اُردو کا مولد و ماویٰ دربار تھا نہ بازار اور اُردو اُردو بازار سے نہیں نکلی بلکہ اُردو بازار اُردو کے لئے بنایا گیا ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کی دھاک ایک عالم میں بیٹھی ہوئی تھی قیاس ہے کہ اسی اثر سے یہ لفظ روس کے ملک میں پہنچا۔ اُردا Orda کے روپ میں وہاں سے یورپ میں آیا اور "ہورڈ" (Hoard) بن گیا۔ دریاے والگا کے کنارے سراے (ملک روس) میں یا تو خاندان کی محلسرا اُردوے مطلا کہلاتی تھی (Golden Ordu) تاشقند اور خوقند میں اب اُردو قلعہ کے معنی میں مستعمل ہے[۳]۔ اسی لئے دلّی کا قلعہ اُردوے معلّٰی کہلایا ہوگا۔ اگرچہ دلّی میں سلطنت کی ابتدا غلاموں سے ہوئی اور عرصے تک قائم رہی۔ یہ غلام ڈال کے ٹوٹے ہوئے ترک تھے

---

[۱] آثار الصنادید ۱۲   [۲] ایضاً بحوالہ تاریخ مرآۃ آفتاب ۱۲

[۳] Hobson Jobson by Col, Henry Jule A. C. Burnnell London 1903 H. 639, 640

تاہم اُردو کا لفظ اپنے لغوی معنی میں مغلوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں رائج نہیں ہوا۔ جہاں تک عہد بالا کے متعلق کتابیں دیکھی گئیں یہ لفظ نظر سے نہیں گزرا۔ انتہا یہ کہ مذکورۂ بالا کتاب بحر الفضائل نے وہ ترکی الفاظ بھی لکھے ہیں جو اساتذہ کے کلام میں مروّج تھے مگر اُس نے بھی اُردو کا لفظ نہیں لکھا۔ حالاں کہ باب الف میں دوسرے ترکی الفاظ مذکور ہیں۔ آردوئے قدیم کے مؤلف نے مؤید الفضلاء کے حوالے سے سکندر لودی کے عہد میں اس کا استعمال بتایا ہے مگر پروفیسر شیرانی نے اس کو مجروح کر دیا ہے۔ قطعی طور پر اِس لفظ کا استعمال عہد بابری سے پایا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک اُردوئے معلّٰی قلعۂ شاہی کے واسطے مخصوص تھا۔ زبان کے لئے عام طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دیکھو سودا کے حال میں میر صاحب فرماتے ہیں: "سرآمد شعرائے ہندی اوست" (نکات الشعراء) سرآمد شعرائے اُردو نہیں فرماتے۔ اسی بیان میں فرماتے ہیں "شاعرِ ریختہ ملک الشعرائے ریختہ او را شاید" یہاں بھی ملک الشعراء اُردو نہیں۔ خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے: "مجلسِ ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست" میر سجاد "شاعرِ خوب ریختہ" فغاں "شعر ریختہ خوب می گوید" پاک باز "در مجمع شاعرانِ ریختہ" ولی "در ریختہ خود بکار بر" سید عبد الولی "میدانِ ریختہ" غرض ہر جگہ ریختہ ہی ریختہ ہے اُردو کہیں نہیں[1]۔ میر حسن کا تذکرہ "تذکرۂ سخن آفرینانِ ہندی زبان" "اول ریختہ از زبانِ دکھن رواج یافتہ" (احوالِ متقدمین) احمد گجراتی کے حال میں "در زبانِ سنسکرت و بھاکا میگویند کہ تصانیف بسیار دارد" .... "دوسہ ریختہ ہم گفتہ" میر محمد حسن کلیم ...... "ترجمہ فصوص در زبان ریختہ کردہ۔ کتابے در نثر ہندی نثر ایجاد نمودہ چنانچہ یک فقرہ بیادِ ماندہ۔ قلمی می نماید .... کل کے دن تھے بادشاہ وزیر۔ آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے بصیر۔ ایسی دولت سے زینہار ...... فاعتبروا یا اولی الابصار" غرض ہر جگہ یہاں بھی ریختہ ہی ریختہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قیام الدین قائم کے تذکرے ہیں۔

بعض اہل الرائے کا قول ہے اور مجھکو اس سے اتفاق ہے کہ عام طور پر لفظ اُردو زبان کے لئے رفتہ رفتہ اٹھارویں صدی کے آخر میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ عہد شجاع الدولہ و آصف الدولہ میں سید عطا حسین نے "نو طرز مرصّع" تالیف کی۔ اس میں ایک ہی صفحے میں اپنی زبان کے لئے "ریختہ" "ہندی" "زبان اُردوئے معلّٰی" استعمال کرتے ہیں۔ خالی "زبان اُردو" یا "اُردو" وہاں بھی نظر سے نہیں گزری۔ اس کے بعد

---

[1] نکات الشعراء ۱۴

رفتہ رفتہ محض لفظ "اردو" زبان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ مصحفی ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

"قواعد زبان اردو" (دریائے لطافت انشاء، دیباچہ) داغ ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے[1]

یہ بحث کہ ہندی کی جگہ پر اردو نے کیوں قبضہ کیا، آگے ملاحظہ ہو:

(۴) ہندوستانی | چوتھا نام ہماری زبان کا "ہندوستانی" ہے اور یہ خالص یورپین پیداوار ہے۔ اس نام میں خاص غور کی ضرورت ہے اس لئے کہ بعض پیچیدہ مسائل اسی کے استعمال سے پیدا ہوگئے ہیں۔

سب سے پہلے پرتگیزوں نے سترہویں صدی عیسوی میں ہماری زبان کا نام "انڈوستان" (Indostani) رکھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان 'مور' کہلاتے تھے۔ اسی صدی میں زبان کو 'انڈوستانی' بھی بول جاتے تھے 'مور' بھی کہدیتے تھے۔ ۱۶۹۷ء میں ہندوستانی زبان (Hindostani Language) کا لفظ پایا جاتا ہے۔ ۱۷۲۶ء میں ایک مورخ لکھتا ہے "یہاں کی (ہندوستانی) زبان ہنڈوسٹانڈ (Hindostand) یا 'مورز' ہے" اٹھارویں صدی تک عام طور پر ہندی زبان کا نام 'مور' رہا۔ جیسا کہ ٹامل کا "ملابار" اور بنگالی کا "بنگان" اردو کو اسی طرح 'انڈوستان' کہتے تھے۔ اور یہ بھی سن لو کہ شاہی فوج کے افسر اس نیک بخت کو کالی زبان (Black Language) کہتے تھے۔ سیاہ تالو تو سنا ہوگا، سیاہ زبان بھی سن لو۔ ہندوستانی کے معنی بھی سننے کے قابل ہیں۔ "ہندوستانی ..... اس ملک کی زبان ہے۔ مگر فی الحقیقت بالائے ہند کے محمدیوں کی زبان اور بالآخر دکن کے محمدیوں کی زبان جو میانِ دوآب کی ہندی بولی سے خصوصاً اور اس حصۂ ملک کی بولی سے جو آگرہ و دہلی کے نواح میں ہے فارسی الفاظ و جملوں کی آمیزش سے بنی اور جو دوسرے غیر ملکی الفاظ سے

[1] نوراللغات و امیراللغات ۱۲

قبول کرنے کو بھی تیار ہے۔ اس کا نام اُردو بھی ہے۔ یہ زبان عرصۂ دراز تک مسلمانوں کی زبان عام (Lingua franca) تمام ہندوستان میں خصوصاً رہی اور اب بھی اُس کو یہ امتیاز ملک کے بڑے حصے اور خاص جماعتوں میں حاصل ہے۔ اولڈ فیشن کے انیگلو انڈین اس کو مورز کہتے تھے[1]۔ اب ہندی کے معنی سنو۔ "بہت ہی عام طور پر یورپین ہندوستان کی اُن زبانوں کو کہتے ہیں جو فارسی محاورات سے بمقابلہ ہندوستانی کے کمتر متغیر ہوئی ہیں جو خصوصاً ممالک مغربی و شمالی (اب صوبجات متحدہ۔ شروانی) کے دیہاتی رقبے ہیں اور اُن کے سرحدی مقاموں میں بولی جاتی ہیں۔ ہندی کا سب سے قدیم کلام 'چاند بردائی' کی مشہور نظم ہے" گرائرسن نے اپنی کتاب میں جس کا نام "ہندوستان کا موجودہ دیسی ادب" ہے تین زبانوں سے بحث کی ہے مارواڑی، ہندی اور بہاری۔ اِن کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ زبانیں ہندوستان کی ہیں جس سے مراد راجپوتانہ میان دوآب جمنا و گنگا کنارۂ دریائے کوسی تک ہے۔" یہ بھی لکھا ہے کہ "میں نے پردیسی ادبی اُردو کو خارج از بحث رکھا ہے۔" اسی مستند ماہر زبان کا ایک اور فقرہ قابل غور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اُنیسویں صدی کا نصف اول جو مرہٹوں کی حکومت سے لے کر غدر کے زمانے تک رہا۔ ایک ممیز عہد ہے۔ گزشتہ صدی کی ادبی تباہی کے بعد یہ ترقی اور تجدد کا دور تھا۔ شمالی ہند میں اسی زمانے میں عملاً مطبع کا ظہور ہوا۔ اور تلسی داس کی روح کی رہنمائی سے صحیح قسم کا ادب سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا۔ یہ زمانہ ہندی زبان کی پیدائش کا تھا جو انگریزوں کی ایجاد تھی جس کا پہلا استعمال تالیف نثر میں گلکرسٹ کی زیر تعلیم سنہ ۱۸۰۳ء میں للوجی لال نے کیا جو پریم ساگر کے مؤلف تھے[2]۔" اس بحث کی مناسبت سے فورٹ ولیم کی خدمات ادبی پر پھر ایک نظر ڈالنی مناسب ہے۔ اٹھارویں صدی کے خاتمے پر لارڈ ولزلی کے عہد میں فورٹ ولیم کالج سرکاری افسروں کو یورپین اور دیسی زبانوں کی تعلیم دینے کے واسطے قائم ہوا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اُس کے صدر مقرر ہوئے۔ جن کی سرپرستی میں بہت سی اُردو کتابیں لکھی گئیں۔ اسی دور میں اُردو کے لئے، ہندوستانی کا لفظ سندی ہو گیا۔ چنانچہ جان گلکرسٹ نے اپنی مشہور "انگریزی ہندوستانی" ڈکشنری لکھی جو کلکتے سے سنہ ۱۶۹۲ء میں شائع ہوئی۔ علیٰ ہذا القیاس

---

[1] Hobson Jobson pp. 417, 418, 639, 640, 415, 584.
[2] Griersons the Modern vernacular Literature pp. VII.

ہندوستانی علم اللسان[1]۔

میر امّن باغ و بہار میں لکھتے ہیں "جان گلگرسٹ صاحب نے ...... فرمایا کہ قصّے کو ایسی ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان۔ عورت مرد، لڑکے بالے۔ خاص عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ...."

فورٹ ولیم کی سرپرستی کی جہاں اُردو نثر ممنون ہے وہاں للوجی لال کی تصانیف بھی ہیں جن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ "انھوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے زبان اور طرزِ بیان کا ایسا پسندیدہ نمونہ پیش کیا کہ متأخر ہندی اہلِ قلم نے اِسی پر اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں (للوجی لال اور سدل مسرا) نے اس زمانے کے عام اُردو مؤلفین کے برخلاف اُردو تحریر سے عربی فارسی کے ثقیل اور غیرمانوس الفاظ نکال کر سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے زیادہ سلیس اور عام فہم الفاظ داخل کئے اور اپنی کتابیں دیوناگری رسم خط میں لکھ کر ہندی نثر نویسی کے اعلیٰ نمونے قوم کے آگے پیش کئے"[2]

گرائرسن کی شہادت ملاحظہ ہو: "۱۸۰۳ء میں گلگرسٹ کی زیرِ تعلیم للوجی لال نے مخلوط اُردو میں ترجمہ اکبر کے لشکری شاگرد پیشہ کی اور بازار کی جہاں تمام قوموں کے آدمی جمع ہوتے تھے) زبان تھی پریم ساگر لکھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ مولف نے اسم اور حروف ربط ہندی الاصل بجائے عربی و فارسی الاصل کے استعمال کئے اس کا نتیجہ عملاً ایک نو ایجاد بولی ہوئی جس کی گرامر اگرچہ نمونۂ سابق کے مطابق تھی مگر محاورہ بالکل بدل گیا۔ یہ نئی زبان جس کو یورپین ہندی کہتے ہیں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بطور ہندوؤں کی زبانِ عام (لنگوا فرینکا) کے اختیار کرلی گئی اور اس کی ضرورت تھی جو پوری ہوگئی۔ یہ زبان مسلّمہ ذریعہ ادبی نثر کا تمام شمالی ہند میں بن چکی ہے۔ اگرچہ بوجہ اس کے کہ وہ کہیں کی بولی نہیں نظم نگاری میں کام نہیں آئی اگرچہ بڑی سے بڑی ہستی نے اس کی کوشش کرلی ہے مگر کامیاب نہ ہوئی۔ لہٰذا شمالی ہند میں آج کل ادب کا یہ لاثانی عالم نظر آتا ہے کہ اُس کی نظم ہر جگہ مقامی بولیوں میں لکھی جاتی ہے۔ خصوصاً برج بیسواڑی اور بہاری میں اور اُس کی نثر ایک یکساں مصنوعی بولی میں جو کسی ہندی نژاد کی مادری زبان نہیں اور جس کو اُس کے ایجاد کنندوں کی سرپرستی نے بزور منوالیا۔ اس لئے کہ اُس میں ابتداءً جو کتابیں لکھی گئیں وہ نہایت عام پسند حیثیت کی تھیں اور اس وجہ سے کہ اُس نے ایسا میدان پایا

---

[1] ارباب نثر اُردو ص ۱۷ و ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۵۱

جس میں وہ علانیہ طور پر مفید ثابت ہوئی۔[۱] ڈی ٹاسی کے بیان پر بھی ایک نظر مناسب ہے۔ یہ مشہور فرانسیسی مصنف ادبی بیان میں مؤلفین و شعراء کے مذہب کا تعین ضروری سمجھتا ہے۔ سنی شیعہ کی تصریح کرتا ہے۔ نصرتی کو برہمن بنا دیتا ہے زبان کی تقسیم بھی اسلامی اور ہندوی کرتا ہے۔ اپنے خطبۂ دوم (۱۸۵۱ء) میں کہتا ہے۔ "ہندوستانی زبان کی ہندوی اور اسلامی شاخوں کا علم ادب صرف کثیر ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا بھی ہے۔ سنسکرت کے فریق سے (جن کی زبان ہندو ہندوستانی ہے) ہمیں شکنتلا کا قصہ ملے گا۔ فارسی کا فریق (جن کی زبان اسلامی ہندوستانی ہے) ولی کا دیوان پیش کرے گا۔ اب رہا خالص ہندوستانی فریق۔ اس سے ایک کتاب "مہر و ماہ" آپ کو سناؤں گا جس طرح ہندوستانی لکھنے کے دو طریقے ہیں ایک فارسی حروف مسلمان ہندوستانی کے لئے دوسرا دیوناگری میں ہندو ہندوستانی کے لئے۔ ہندوی اور مسلمانی دونوں شاخوں میں نظم مقفیٰ ہوتی ہے۔

ایک قصہ نظم میں جس کا نام "بخت جگر" ہے۔ بال مکند سکندرآباد کے رہنے والے نے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ شخص ہندو ہے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مگر اس نے یہ تصنیف اردو ہی میں کی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اردو شمال میں مسلمانوں کی ہندوستانی ہے۔" یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ کیا سکندرآباد نواحِ دہلی میں بھی ہندو مسلمانوں کی بولی جدا جدا تھی؟

تیسرا لکچر ۵ دسمبر ۱۸۵۲ء "ہندوستانی اہلِ ہند کی زبان ہے۔ مگر یہ زبان اپنے حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے۔ خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نمائے ہندوستان میں، نیز ایران، تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں۔ اہلِ یورپ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے ہندوی بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے لئے ہندوستانی کا نام قرار دے لیا ہے اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اردو ممالکِ مغربی و شمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔ ہندوستانی زبان یا ہندوستانی (یعنی ہندوستان کی زبان) کی یہ تفریق (یعنی ہندی اور اردو) مذہب نے پیدا کی ہے۔ اور اس لئے عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔"[۲]

---

[۱] Grierson's Modern vernacular Literature of Hindustan Ch. X P. 107

[۲] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۸ء ترجمہ خطبہائے ڈی ٹاسی مترجمہ نواب مسعود جنگ بہادر ۱۲

فورٹ ولیم کالج اور دیگر یورپین ادبی سرگرمیوں کا منجملہ بہت سے نتائج کے جو ایک نتیجہ زبان کی تفریق کا
پیدا ہوا اس کا قصّہ ستارۂ ہند راجہ شیو پرشاد کے قلم کی زبانی سنئے۔ راجہ صاحب کی نسبت گرارسن نے لکھا ہے:
" وہ اپنی اس کوشش کے لئے مشہور ہیں کہ ہندوستانی زبان کے ایک ایسے طرز کو عام فہم بناویں جس کو
وہ آگرہ، دلّی اور لکھنؤ یا خاص ہندوستان کی عام بولی کہتے ہیں جو فارسی سے گراں بار اردو اور سنسکرت سے
گراں بار ہندی کے درمیان میں ہے۔ اس کوشش نے ایک گرما گرم اور ہنوز غیر منفصل مباحثہ باشندگانِ ہند کے
درمیان پیدا کر دیا ہے[1]" غرض راجہ صاحب لکھتے ہیں " یہ عجیب غریب بات ہے کہ ہماری دیسی زبان متواتر ایسے
دو خطوں میں لازماً لکھی جائے جیسے فارسی اور ناگری ہیں۔ ایک سیدھی طرف سے لکھا جاتا ہے دوسرا الٹی طرف سے
لیکن یہ بالکل انوکھی بات ہے کہ اس کی گرامریں بھی دو ہوں۔ یہ حماقت ڈاکٹر گلکرسٹ کے وقت کے پنڈتوں اور
مولویوں کی بدولت وجود میں آئی۔ وہ مامور تو اس امر پر تھے کہ بالائے ہند کی عام زبان کی ایک عام صرف و نحو
بنائیں۔ مگر انھوں نے دو گرامریں بنا دیں ایک خاص فارسی، عربی کی دوسری خالص سنسکرت اور پراکرت کی۔
مولوی سنسکرت سے ناواقف تھے اور انھوں نے یہ بات نظر انداز کی کہ ہماری زبان کی بنیاد آرین ہے۔ اسی طرح
پنڈت سامی اثراتِ مابعد کے قبول کرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ یہاں سے وہ اردوئے فارسی نکلی جو سرکاری
دفتروں میں ہے جس کو عام آبادی نہیں سمجھ سکتی ہے۔ اسی طرح پریم ساگر کی خالص ہندی ناقابلِ فہم ہے۔ ایک تو ثنویت
سے اس قدر عاری ہے کہ مقبولِ عام نہیں ہو سکتی دوسری طفلانہ انداز میں ان واقعات سے انکار کرتی ہے جن کے
اثر سے اردو ایک زبان بن گئی۔ نتیجۂ بد اس کا یہ ہے کہ بجائے عام دیسی زبان کے اسکول گرامر بنانے کے یا
بالفاظ دیگر ایک ایسی عام گرامر کی جو فارسی اور ناگری دونوں حرفوں میں بے کھٹکے لکھی جائے ......
...... ہمارے یہاں دو متضاد اور مخالف جماعت کی کتابیں ہیں ایک مسلمان اور کایستھوں کے لئے
دوسرے برہمنوں اور بنیوں کے لئے[2]" دوسری جگہ لکھتے ہیں " نادان مولویوں اور پنڈت دونوں کی یہ
بڑی بھول ہے کہ ایک تو سوائے فعل اور حرفوں کے باقی سب الفاظ صحیح فارسی عربی کے کام میں لانا چاہتے ہیں
اور دوسرے صحیح پانن کے ٹکسال کی کھری گھڑی سنسکرت گویا یہ جو ہزاروں برس سے ہم ہی لوگ ہزاروں جاہلوں کے

---

۱ Grierson's M. V. L. P 140

۲ اردو صرف و نحو کا انگریزی دیباچہ مطبع سرکاری الہ آباد ۱۸۷۷ء مولفہ راجہ شیو پرشاد۔

سبب ہزاروں [illegible] اپنی بولی میں کرتے چلے آئے ہیں وہ اُن کے رتّی بھر بھی لحاظ کے قابل نہیں بلکہ
اس دستور کی جسے ایک طبعی قانون کہنا چاہیئے اُن کے آگے کچھ گنتی ہی نہیں۔ سخت
شکل سنسکرت لفظوں کو جو ہزاروں برس دانت ہونٹ جیبھ سے ٹکراتے ٹکراتے گول مٹول پہاڑی ندّی کی
بٹیا بن گئے ہیں۔ پنڈت جی پھر ویسے ہی کھردرے سنگھاڑے کی طرح نکیلے تپھر کے ڈھوکے بنانا چاہتے ہیں جیسے
وے ندّی میں پڑنے سے پہلے پہاڑ سے ٹوٹنے کے وقت رہتے ہیں اور مولوی صاحب اپنے عین قاف کام میں
لانا چاہتے ہیں۔ کر بے چارے لڑکے بلبلاتے بلبلاتے اونٹ ہی بن جاتے ہیں۔ پر تماشا یہ ہے کہ ادھر تو مولوی
صاحب یا پنڈت جی ایک لفظ صحیح کرنے میں یا پردیسی ہونے کے قصور میں اسے کالے پانی جانے کا حکم دیتے ہیں اور
اُدھر تب تک لوگ سَو لفظوں کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس دیس کی بولی کا فارسی عربی ترکی اور انگریزی
لفظوں سے خالی کرنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے کوئی انگریزی کو یونانی، رومی، فرانسیسی الیمانی وغیرہ پردیسی
لفظوں سے خالی کرنا چاہے یا جیسے وہ ہزاروں برس پہلے بولی جاتی تھی اُس کے اب بولنے کی تدبیر کرے۔[1]
ایک اور ماہر زبان کی رائے سُنا کر اس داستان کو ختم کرتا ہوں۔ "تمام تر کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ملک کی زبان اُردو
ہے یعنی تیس چالیس برس اُدھر کی اُردو جس کی بنیاد ہندی ہے بیرونی الفاظ کی بے تکلّف آمیزش کے ساتھ،
کیوں کہ یہی وہ شکل ہے جس میں وہ خود بخود متشکل ہوئی ہے۔ اُس کے رنگ برنگ ہونے کو برداشت کرنا بلکہ سراہنا
چاہیئے۔ درآں حالے کہ مصنوعی یکسانیت ناکامی کے مرادف ہوگی ... ... بہت تھوڑا زمانہ گزرا کہ ہندو اور
مسلمان دونوں کی زبان کا ایک ہی روزمرّہ تھا۔ اگرچہ ہندو ابتدائی موانست اور شاید ایسے مضامین کی قدرتی
نوعیت کی وجہ سے بھی جن کا تعلق دیومالا سے ہو فطرۃً (لیکن نہ لازم یا متناسب طور پر) زیادہ سنسکرت کے
الفاظ استعمال کرتے اور مسلمان اپنی مذہبی نوعیت سے زیادہ فارسی کے الفاظ۔ اب عین وقت ہے کہ یہ خیالی امتیاز
پھر وحدت میں ڈبو دیا جائے اور ملک کی زبان عام تناسب کے مطابق ہندوستانی کے نام سے مشہور ہو۔"[2]

---

[1] تتمہ بزبان اُردو صرف نحو مذکورۂ بالا ۱۲

[2] "Some objections to the Modern style of official Hindustani" by F. S. Growse, M.A. (Oxon) B. S. C.

ان مباحث کے مختلف پہلوؤں پر اور اُن کے آثار و نتائج پر غور و تامل بمقابلہ کسی طویل لفظی بحث کے زیادہ مناسب اور نتیجہ خیز ہوگا۔

موجودہ ادبی اور علمی ادارات

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا اُس کا تعلق اُردو کے دَورِ ماضی سے تھا۔ اس حصّے میں ہم بعض دورِ حاضرہ کے مہتم بالشان اُردو کے کارناموں پر روشنی ڈالنی چاہتے ہیں۔

(۱) دارالمصنفین اعظم گڑھ زمانۂ حال میں متین تعلیمی اور علمی اُردو ادب کی اشاعت کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں یہ مجلس ممتاز شان رکھتی ہے۔ یہ مجلس علّامہ شبلی مرحوم کے "خیال" کی تعمیل ہے۔ علّامہ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کے خاص تلامذہ اور احباب نے ۱۹۱۵ء میں اس کی بنیاد ڈالی۔ خود علّامہ مرحوم نے گوشہ نشین اعظم گڑھ کو اس مجلس کا مقام تجویز کر کے اپنے دو بنگلے وقف کر دیئے تھے۔ دارالمصنفین ایک مجلس کے تحت انتظام ہے جس کے ارکان ملک کے ایسے علم دوست افراد ہیں جن کو علم کا صحیح ذوق ہے۔ نواب عمادالملک بلگرامی مرحوم اپنی حیات تک صدر نشین رہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی ناظم ہیں اور مولوی مسعود علی صاحب مہتمم، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی دونوں روح رواں ہیں۔ عربی اُردو انگریزی کتابوں کا وسیع کتب خانہ ہے، پریس ہے اور ان سب ضرورتوں کے واسطے دارالمصنفین کی خود اپنی پختہ عمارتیں ہیں۔ اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن کی تعداد تیس سے زیادہ ہے اور باعتبار تقسیم علوم۔ سیرۃ، فلسفہ، تاریخ علوم، تاریخ و آثار اور ادبیات کی ہیں۔ معارف نامی رسالہ ماہوار شائع ہوتا ہے جو باعتبار خوبی مضامین کے بہترین رسالوں میں شمار ہو سکتا ہے اور جس نے علمی مضامین کا باوقار نمونہ اُردو میں پیش کیا ہے۔ آمدنی کا بڑا حصّہ مستقل ہے۔ گزشتہ سال باون ہزار سے زاید کی آمدنی تھی۔ رفقا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود اعظم گڑھ میں قیام کر کے تصنیف و تالیف میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے قیام کے واسطے دارالمصنفین کی عمارت میں۔ مکانات مہیّا ہیں۔ دوسرے وہ علما ہیں جو باہر رہ کر اپنی تصانیف سے دارالمصنفین کو فیض یاب فرماتے رہتے ہیں۔ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے بعض بہترین دماغ اس علمی مجلس میں کارفرما ہیں۔

(۲) **انجمن ترقی اُردو** اس انجمن کا اصل مقصد یہ ہے کہ "زبان اُردو کو مشرقی و مغربی علوم و فنون سے بذریعۂ ترجمہ و تالیف مالا مال کیا جائے۔" یہ انجمن بھی ایک باضابطہ مجلس کے زیرِ نگرانی کام کر رہی ہے جس کے صدر سر سید کے نامور پوتے نواب مسعود جنگ بہادر ہیں۔ ارکان میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو جیسے ادب دوست بھی شامل ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلے سکرٹری علامہ شبلی مرحوم تھے۔ اب ملک کے مشہور محقق ادیب مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ چند روز مولوی عزیز مرزا مرحوم نے بھی اس خدمت کا سرانجام کیا تھا۔ ۱۹۱۳ء سے اورنگ آباد (ریاست حیدرآباد) اس مجلس کا مستقر ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل علوم و فنون کی کتابیں انجمن شائع کر چکی ہے:

(۱) شعر و سخن : ۸ (۲) قواعد و زبان و لغت ۷

(۳) تعلیم و تربیت ۴ (۴) تاریخ و سیر ۱۰۔

(۵) سائنس۔ ۱۰ (۶) فلسفہ ۲

اقتصادیات ایک۔ مذہب ایک۔ جملہ ۴۰۔ اس وقت انجمن علاوہ اور تالیفات کے متعدد لغتوں کی تیاری میں مصروف ہے:-

(الف) انگریزی سے اُردو۔ یہ مبسوط اور مکمل لغت ہو گی۔ اس کی تیاری میں مختلف انگریزی لغات سے مدد لی گئی ہے۔ تکمیل ہو چکی۔ طباعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔

(ب) پیشہ وروں کے اصطلاحات کی لغت۔ یہ بھی تیار ہے۔ صرف تصویروں اور نقشوں کی تکمیل باقی ہے۔

(ج) لغت زبانِ اُردو۔

(د) لغت زبانِ دکنی۔

کتابوں کے علاوہ دو سہ ماہی رسالے بھی انجمن شائع کرتی ہے۔

اوّل۔ اُردو۔ جو بہترین اُردو ادبی رسالہ کہا جا سکتا ہے جس کے مضامین نے اُردو ادب کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔

دوم۔ سائنس۔ اس میں خالص سائنس کے مضامین ہوتے ہیں مقصد یہ ہے کہ سائنس کے

مسائل و خیالات اُردو داں پبلک میں مقبول بنائے جائیں۔ انجمن ملک کے اُردو کتاب خانوں کی کتابوں سے مدد کرتی ہے۔ انجمن کی شاخیں (یعنی کتاب خانے) سارے ملک میں قائم ہیں جن کی تعداد اس وقت ۹۶ ہے۔

(۳) جامعۂ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) عام طور پر یہ خیال ہے اُردو زبان میں صرف شعر و شاعری کا ذخیرہ متقدمین کی کوشش سے جمع ہوا۔ علوم و فنون کے سرمائے کی طرف توجہ نہیں کی گئی مگر یہ خیال قلّت معلومات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قریباً ایک صدی سے اُردو کو سائنس کے سرمائے سے با مایہ بنانے کی کوششیں جاری رہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے سب سے اوّل نمایاں کوشش حیدرآباد دکن کے مشہور امیر کبیر نواب شمس الامراء فخر الدین خاں بہادر نے کی۔ نواب صاحب ممدوح نے ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں یعنی آج سے تقریباً سو برس پہلے) سائنس کی انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا۔ اُن میں سے ایک مجموعے کا نام (شمس الامراء کی مناسبت سے) ستّہ شمسیہ ہے۔ یہ چھ رسالے حسب ذیل علوم کے ہیں :-

(۱) جرثقیل (۲) ہیئت (۳) علم آب (۴) علم ہوا (۵) علم انظار (۶) علم برقاب و گیالوی نزم مقناطیس۔ ان رسالوں کے ترجمے کی کیفیت خود نواب صاحب کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے :-

> "حمد و نعت کے بعد بندہ نیاز مند درگاہ ایزدی کا فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلانِ طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ون گے از بر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ علم جرثقیل اور علم انظار وغیرہ۔ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعض علوم اہل فرنگ نے ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدّت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جائے کہ فرصتِ قلیل میں اُس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اُس کے مطالعے کا بار ہوگا ...... چنانچہ ان دنوں میں بحسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے

لکھے ہوئے رسالے رانٹ چارلس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۱ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے ہم پہونچے ...... میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدرآبادی اور مسٹر جونس اور موسی تندوسی کو جو ملازمان سرکار ہیں حکم کرتے ہیں آیا کہ اُن علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں - چنانچہ بفضل حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے - مگر بعضے اسماء انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے اُن کو اُسی زبان اصلی پر بحال رکھنے میں آیا"۔ ....

یہ رسالے ۱۲۵۶ھ میں سرکار شمس الامرا کے چھاپے خانے میں ٹائپ میں چھپے ہیں۔ منجملہ ستۂ شمسیہ کے دوسرا پانچواں اور چھٹا رسالہ میرے پاس بھی ہے۔ اشکال اور نقشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت اہتمام اور صحت کے ساتھ مثل انگریزی نقشوں کے چھاپے گئے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ان رسالوں کا طرز املا بجنسہ وہی ہے جو آج کل رائج ہوا ہے اور جس کو پنجاب سے منسوب کرتے ہیں۔ یائے معروف اور یائے مجہول اور اظہار نون اور اخفائے نون کا املا ٹھیک آج کل کے قاعدے کے بموجب ہے۔ نیز ناموں پر اور خاص خاص الفاظ پر خط بھی کھینچا ہوا ہے۔ شمس الامراء بہادر نے صرف ترجمے اور اشاعت پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اُن کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بھی جاری کیا جس کا نام مدرسۂ فخریہ تھا جس کے مٹے ہوئے سے نشان اب تک باقی ہیں۔

ایک مکمل نسخہ ستۂ شمسیہ کا میرے یہاں مطبع اسلامیہ مدراس کا چھپا ہوا ہے جو ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالے پبلک میں مقبول بھی ہوئے۔

اس کے علاوہ اور بھی شخصی کوششیں سائنس کو زبان اُردو میں لانے کی ہوتی رہیں۔ چنانچہ ڈاسی ٹاسی اپنے لیکچر (۳ دسمبر ۱۸۵۰ء) میں لکھتا ہے "ہندوستانی زبان کی اُن کتابوں میں سے جو حال میں شائع ہوئی ہیں بہت سی سائنس، جغرافیہ، قانون اور دوسرے علوم پر ہیں"۔ دہلی کالج نے بھی علمی تراجم کی خدمت انجام دی تھی۔

اسی سلسلے میں سرسید احمد خاں مرحوم ومغفور نے ایک منظم اور باقاعدہ کوشش سنٹفک سوسائٹی قائم کر کے فرمائی۔ یہ سوسائٹی بمقام غازی پور ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی۔ "ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے مربی پیٹرن تھے اور ممالک مغربی وشمالی اور پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نائب مربی۔ اور دور دراز صوبوں کے بہت سے

رئیس اور ذی عزت ہندو مسلمان ارکان "۔ اس سوسیٹی نے قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں (حیات جاوید حصّۂ دوم صہ ۲۶) مگر یہ تمام کوششیں نورِ علم کے پھیلانے میں وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو سورج نکلنے سے پہلے روشنی کا ہوتا ہے۔ ابھی طلوعِ آفتاب کا انتظار تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں طالع ہوا۔

جامعۂ عثمانیہ اس عہد کا ایسا شان دار اور نتیجہ آفریں کارنامہ ہے جس نے علاوہ علوم و فنون کی حقیقی خدمت کے زبانِ اُردو کو اس قابل بنادیا ہے کہ علمی زبانوں کی مجلس میں شامل ہو سکے۔

اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد حضور نظام کے فرمانِ مبارک متر شّدہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۶ راپریل ۱۹۱۷ء میں حسب ذیل درج ہے:-

" ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دُور ہو کر جسمی، دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبا کے اخلاق کے درستی کی نگرانی ہو۔ اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے "۔

" غور و خوض کے بعد اس فرمان واجب الاذعان کی تعمیل میں محکمۂ تعلیمات سرکارِ عالی نے فوراً جامعہ کی عملی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے ابتدائی کام شروع کیا اور اُس کے شعبۂ فنون و دینیات کے نصاب پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اُن کمیٹیوں نے نصابوں کے جو مسوّدے تیار کئے وہ انگلستان اور ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں گشت کرائے گئے اور ترقی خواہانِ جامعہ کو اس امر کے علم سے اطمینان ہوا کہ تعلیم کے متعلق جن نتائج پر وہ پہونچے تھے اُن کو تعلیم کے سربرآوردہ ماہروں نے کم و بیش پسند کیا۔

" جامعہ کا یہ پہلا تعمیری کام تھا کہ ایک شعبۂ تالیف و تراجم قائم ہوا۔ جس میں اولاً آٹھ قابل مترجموں کا تقرر عمل میں آیا۔ اور یہ کام ملک کے ایک مشہور ادیب اور مصنف کی نگرانی میں دیا گیا "۔

بہت صبر آزما کام وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس پر جاں فشاں مباحث ہوئے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف علوم کے ماہر علما کی ایک کمیٹی شعبۂ ہذا کے ساتھ ہے جو وضع اصطلاحات کی خدمت انجام دے رہی ہے۔

مہر ۱۳۲۸ف م اگست ۱۹۱۹ء میں "کلیۂ جامع عثمانیہ" (عثمانیہ یونیورسٹی کالج) کا افتتاح ہوا۔ پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ کا ۱۹۲۱ء میں اور بی اے کا ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اب یونیورسٹی ایم اے تک تعلیم دے رہی ہے۔

شعبۂ فنون میں حسب ذیل فنون کی تعلیم جامعۂ عثمانیہ میں بزبان اُردو ہو رہی ہے:۔

تاریخ (مشرقی ومغربی قدیم وجدید)۔ فلسفہ، معاشیات، ریاضیات (نظری وعملی)، طبیعات، کیمیا، قانون، نباتیات، حیاتیات، انجنیری، طب (ڈاکٹری)۔

ممتحن باہر کے علما بھی ہوتے ہیں۔ ان علما کی جو رپوٹیں نتائج امتحان کی بابت موصول ہوتی ہیں اُن میں تسلیم کیا گیا ہے کہ طلبا نے خوب سمجھ کر پڑھا اور اُن کے جوابوں سے خیالات کی جدت اور تازگی ظاہر ہوتی ہے متعدد انٹرمیڈیٹ کالج اس یونیورسٹی سے ملحق ہو چکے ہیں۔ جن میں ایک زنانہ بھی ہے مستقل عمارت کے لئے چودہ سو ایکڑ زمین حاصل ہو چکی ہے۔ ایک کروڑ روپیہ مصارف کے لئے منظور فرمایا گیا ہے۔ سالانہ مصارف دس لاکھ روپیہ سے زائد ہیں۔

دارالترجمہ نے اب تک ایک سو گیارہ ۱۱۱ کتابیں حسب ذیل علوم کی شائع کی ہیں:۔

(۱) انگریزی سے ترجمہ ہوئیں } فلسفہ ۹، قانون ۴، سائنس ۲۴، ریاضی ۱۵ معاشیات ۲، تاریخ ۴۵، جغرافیہ ۲، جملہ ۱۰۱

عربی سے ترجمہ ہوئیں } فلسفہ ۱، تاریخ ۴۔ جملہ ۵

فارسی سے ترجمہ ہوئیں } تاریخ ۵

ستر کتابیں ترجمہ ہونے کے بعد بعض زیر نظر ثانی ہیں یا طبع ہو رہی ہیں۔ ان میں ۹ ڈاکٹری کی ہیں اور ۹ انجنیری کی۔ ۶۵ کتابیں زیر ترجمہ ہیں۔ جملہ ۲۴۶

علاوہ تراجم کے ۱۸ کتابیں تالیف ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں نے جامعۂ عثمانیہ کو تسلیم کر لیا ہے اور انگلستان میں شمالی مجموعے نے (Northern Groups) آکسفورڈ اور کیمبرج

اور لندن کی یونیورسٹیاں یہاں کے طلبا کو اُسی رعایت سے اپنے یہاں داخل کرتی ہیں جس رعایت سے ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا کو داخل کرتی ہیں۔ انگلستان کے انڈین سول سروس کے امتحان میں بھی جامعۂ عثمانیہ کے طلبا کا داخلہ حکومتِ ہند منظور فرما چکی ہے۔

خاتمہ

میں ممنون ہوں کہ آپ نے میری پریشاں بیانی صبر وتحمل سے سماعت فرمائی۔ مجھکو اُردو کے متعلق ماضی وحال کی جو داستان کہنی تھی عرض کر چکا۔ اب مذکورۂ بالا بیان پر ایک نظر اور چند خیالات کا اظہار خاتمۃ الباب ہے۔

اُردو کی جو تاریخ مختصراً میں نے عرض کی ہے اُس سے واضح ہوا ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش دیسی اور پردیسی زبانوں کے میل جول سے ہوئی ہے۔ زبانوں کا یہ میل جول ابتدا ہی سے اُس ربط اور اُنس کا نتیجہ تھا جو اہلِ زبان کے باہم پیدا ہوا۔ تاریخ سندھ کا جو واقعہ شروع میں عرض کر چکا ہوں وہ ابتدائی ربط کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ زمانۂ مابعد میں کیا ہوا۔ اُس کی کیفیت حال کے سبب سے زیادہ مشہور ملکی مورخ کی زبانی سننی مناسب ہوگی۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے سال حال کے آغاز میں جو پُر مغز تاریخی لکچر مدراس یونیورسٹی کی سرپرستی میں بمقام مدراس بہ عنوان (India through the Ages) دیئے اُن میں مسلمانوں کے عہد کی حسب ذیل دس نعمتیں شمار کی ہیں۔ خلاصۃً:

(۱) بیرونی ممالک سے از سر نو تعلقات۔

(۲) اندرونی امن۔

(۳) انتظام کی یکسانی۔

(۴) شرفا میں خواہ کسی مذہب کے ہوں لباس و رسم کی یکسانی۔

(۵) انڈو سیریسن۔ دستکاری جس میں قرونِ وسطیٰ کے ہندو اور چینی اسکول ہموئے گئے ہیں۔ ایک نئی طرزِ عمارت۔ لطیف مصنوعات کی ترقی (یعنی شال، پچکاری، کمخواب، ململ، قالین وغیرہ)

(۶) ایک عام زبان جس کا نام ہندوستانی یا ریختہ ہے۔ اور سرکاری نثر کی طرز جو زیادہ تر ہندو منشیوں نے تحریر فارسی میں ایجاد کی اور جس کو مرہٹہ چٹ نویسوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا)

(۷) ہماری دیسی زبان کا عروج جو اس امن اور رفاہی خوش حالی کا نتیجہ تھی جو دہلی کے شہنشاہی کے دور میں نصیب ہوئی۔

(۸) توحید مذہب کا احیا اور تصوّف۔

(۹) تاریخی ادب۔

(۱۰) ملکی اور جنگی آئین میں ترقیاں۔

اس فہرست پر ایک نظر ہی ثبوت اس امر کا ہے کہ عہد مذکور میں ہندو اور مسلمانوں نے کس طرح مل کر باہمی کوشش سے صنعت، زبان اور آئین کو ترقی دی۔ امن اور خوش حالی نے جو شگفتگی دلوں اور دماغوں میں پیدا کی اُس کا جلوہ جمنا کے کنارے تاج کی صورت میں اور بزم عیش میں قالین وشال کی شکل میں نمایاں ہوا۔ اسی ربط کی بہار نے اُردو ادب کو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مقبول بنا دیا۔ آج ریاست میسور میں اُردو اسکول جاری ہیں۔ گزشتہ سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مدراس میں ہوا تو اُس میں ایک رزولیوشن یہ پاس ہوا کہ آندھرا یونیورسٹی میں اُردو میں تعلیم کا بھی اہتمام ہو۔ ہندوستان کے باہر کابل کے کالج میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ حجاز کی بندرگاہ جدّے میں ایک دہی بیچنے والے حبشی کو صدا لگاتے سنا "دوہی لو دوہی"[1] آسام بھی جہاں مسلمانوں کی سلطنت کو کبھی استقلال حاصل نہیں ہوا، اُردو کے زیر نگیں آجاتا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ نہ صرف اُردو کی ترقی عہد گزشتہ میں ہوئی بلکہ تمام دیسی زبانوں نے فیض پایا۔ بنگالی زبان کی نسبت بنگال کے مشہور اہل قلم ڈاکٹر دنیش چندر سین رائے بہادر لکھتے ہیں :-

> "ہمارے علم ادب کا سب سے ممتاز دور چوتھا ہے جس کا آغاز وشنویوں سے ہوتا ہے جنھوں نے سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کے اثر سے متاثر ہو کر سوسائٹی کے شیرازے کو اتحاد و اخوّت عامّہ کے اصول پر دوبارہ درست کیا۔ وشنویوں کے ادب میں فطرت انسانی کی نزاکت اُس کے حسن کی لطافت اور نفاست کی تصویر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے

---

[1] سیاحت نامہ منشی شمس الدین صاحب ۱۲

کہ اس سے بلند تر پایۂ کمال کا حاصل کرنا ممکن نہیں .... اس زمانہ میں سر رابندر ر ونا تھ ٹگور نے اسی دشنوی چمن سے گل چینی کی ہے .... بنگال میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی علم ادب کی ترقی میں ساتھ دیا۔ اس زمانے میں ان دونوں قوموں میں باہمی مدارات اور رواداری کے خیالات اس قدر قوی تھے کہ آج کل کے سیاسی معاملات میں حصّہ لینے والوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ بہت سی بنگالی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ایسے مسلمان بزرگوں کے حالات درج ہیں جنھیں ہندو مسلمان دونوں مقدس سمجھتے تھے۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :-

"ہماری زبان اور علم ادب دراصل ملک کی ملی جلی آبادی اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔"[1]

اِسی مضمون کے حواشی کے نمبر ۳ تشریح میں بیان کیا ہے کہ بنگالی ادب کی ترقی میں اسلامی توحید نے حصّہ عظیم لیا۔

اب ایک دوسرے دیسی ادب پر نظر ڈالیئے یعنی برج بھاشا۔ گرائرسن کی جس تاریخ کا ہم نے اوپر کئی جگہ حوالہ دیا ہے اُس میں مغلیہ سلطنت کے عہد کو برج بھاشا، بیسواڑی اور بہاری زبانوں کا دورِ اقبال (Augustan age) بتایا ہے۔ لکھا ہے کہ اس لٹریچر کی قدر ہمایوں بادشاہ کے زمانے سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ملک محمد جائسی نے میدان ترقی میں قدم رکھا۔ شاہانِ مغلیہ بہت بڑے مربّی ان زبانوں کے تھے۔ اُن کے زوال کے ساتھ یہ بھی تباہ ہوگئی۔ مرہٹوں کا زمانہ ان زبانوں کی ادبی ویرانی کا تھا۔ خلاصۃً۔ ذرا اس جہاں پرور عالم کو دیکھو کہ اکبری نورتن کے جوہر فردِ خان خاناں کی مجلس میں ایک طرف عرفی و نظیری کی تربیت و قدردانی ہو رہی ہے۔ دوسری جانب سورداس اور تلسی داس (رامائن کے مؤلف) کی۔ اکبر جہاں سلطنت کو بڑھا رہا ہے وہاں فنونِ لطیفہ کی پرورش میں بھی مصروف ہے۔ فن تعمیر مقبرۂ ہمایوں تک ترقی کر گیا ہے جس کی دوسری منزل آگرہ کا تاج تھا۔ فن مصوری میں چینی اور ہندو دونوں مصوّریاں مل کر وہ چہرہ تیار کر رہے ہیں جن پر نادرہ زمانی منصور اور میر کلاں کو ناز ہے۔ فن موسیقی میں میاں تان سین کی قدردانی ہے جو گوالیار کے مشہور عارف باللہ حضرت محمد غوث کے دامن شفقت کے سائے میں اکبری دربار میں پہونچے ہیں۔ فارسی ادب سحر حلال کا رنگ پیدا کر رہا ہے۔ فیضی کی نلدمن تصنیف ہو رہی ہے تو تلسی داس رامائن لکھنے میں مصروف ہیں۔ گرائرسن نے تلسی داس کی تعریف جس بلند آہنگی سے کی ہے اس سے زیادہ مشکل ہے۔

---

[1] مضمون ڈاکٹر دنیش چندر سین رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۲ء ص ۳۶۰ و ۳۶۴

لکھا ہے کہ "گوتم بدھ کے بعد ہندوستان نے ایسا سپوت پیدا نہیں کیا۔ توحید اور صحتِ نظر نے اُس کے کلام کو حقیقت کا راز داں بنا کر بقائے دوام کا خلعت دیا۔" سوال یہ ہے کہ توحید اور صحتِ نظر کہاں سیکھی؟ جواب واقعات سے سنو۔ اسی اکبری دربار میں۔ توحید تو وہی ہے جس نے بنگالی ادب کو سنبھالا۔ صحتِ نظر میں مغلوں سے کوئی بازی لے جائے گا؟ واقعاتِ بابری اور تزکِ جہانگیری میں اس کا روشن ثبوت دیکھ لو۔ گرائرسن نے اپنی مذکورہ بالا تاریخ میں تلسی داس کی ایک دستی تحریر کا عکس شامل کیا ہے۔ یہ فارسی خط میں ہے جس میں ایرانی نشان ہے۔ سرِ لوح "اللہ اکبر" لکھا ہے۔ اس سے سمجھ لو کہ تلسی داس کے ادب میں کیا رنگ جلوہ فرما تھا۔ ادب اُردو اسی اُلفت کے سائے میں پرورش پاتا رہا۔ ہندوستان میں طوائف الملوکی ہوئی۔ سارا ملک میدانِ کارزار تھا۔ تاہم اوّل تو "مہاپاپ" ہندو مسلمان سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوسرے ادب کی مجلسیں اُلفت کے وہ میخانے تھیں جہاں دلوں کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی تھیں ؎

دماغِ دل دریں جا گاہ گاہے چاق میگردد
خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را

ذکرِ میر جو حال میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے ملاحظہ ہو۔ یہ میر تقی میر کی لکھی ہوئی آپ بیتی کہانی ہے۔ وقت وہی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا۔ ہر طرف سے جوہندی تلواریں کھینچ کر میدان میں آکودی۔ خود میر صاحب بھی لڑائی کے معرکوں میں شریک ہیں۔ مگر ساری کتاب پڑھ کر فرقہ بندی یا تفریقِ مذہب کی بُو بھی دماغ میں نہیں آتی۔ مثلاً پانی پت کا درّانی معرکہ میر صاحب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مگر ایک حرف ایسا نہیں لکھتے جس سے نفرت یا تنگ خیالی عیاں ہو۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں "حقیقت ہر دو لشکر آں کہ اگر دکھنیاں جنگ گریز کہ طور قدیم آنہا بود می جنگیدند اغلب کہ غالب می گردیدند۔"

مرزا غالب کے جس تیرِ الفت کے گھائل میر مہدی مجروح ہیں اُسی کے کشتہ مرزا ہرگوپال تفتہ ہیں۔ اسی نشۂ الفت کی رسائی تھی کہ ادب اُردو کی پرورش ہندو مسلمانوں نے مل کر ابتدا سے آخر تک کی۔ اُردو شعرا کے تذکرے دیکھو شمالی ہند میں پہلا دورِ زبان آرزو سے قائم ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ رائے انند رام مخلص ہیں، بیکس، چند بہار ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقم ہیں۔ اپنے وقت میں رائے سرب سنگھ دیوانہ اُستادِ وقت ہیں

جن کے ایک شاگرد جرأت کے اُستاد بھی ہیں یعنی حسرتؔ گلزارِ نسیم کے مؤلف نسیمؔ لکھنوی کو سارا ہندوستان مانے ہوئے ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

یہ تو شعرائے تھے۔ ہندو امرا نے بھی قدردانیوں سے دل بڑھا کر کمال کی سرپرستی کی۔ راجہ شتاب رائے ناظم بنگال و بہار کی قدردانی مشہور ہے۔ اُردو شعر بھی کہتے تھے۔ اُن کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ اُردو کے شاعر تھے میرتقیؔ میر جن جن کے ممنونِ کرم ہیں اُن میں راجہ جگل کشور بھی ہیں۔ مہاراجہ چندو لال کی قدردانیاں آج تک ضرب المثل ہیں پٹنے میں دورِ آخر میں کنور سکھراج بہادر نے رجو معاصر تھے شاہ الفت حسین فریادؔ اُستاد سید محمد علی شادؔ مرحوم اُردو کے ایسے مشاعرے کئے کہ اب تک یاد ہیں ہر مشاعرے میں تین چار ہزار روپیہ خرچ کرتے تھے۔ (حیاتِ فریاد از شاد)

آج بھی دکن میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی سرکار قدردانِ شعرا ہے۔ جب تک اُردو کا ادبی دَور رہا یہ ’’میخانۂ الفت با مہر و نشان‘‘ رہا۔ دفتری دَور میں دوسرے ہی رنگ کھلے۔ اور ہی بحثیں چھڑیں جن کے نتائج آج آنکھوں کے سامنے ہیں۔

زیادہ شکوہ عربی فارسی کی آمیزش کا ہے۔ افراط ہر چیز میں بُری ہے۔ آمیزش اعتدال کی حد تک رہ کر بھی قابلِ اعتراض ہو تو سوال یہ ہے کہ اُردو کو زبانِ عام بننے کی قوت کس نے بخشی۔ ہمارے ملک میں ہزاروں زبانیں ہیں جن کی تفصیل سر جارج گرائرسن کی ایک ضخیم تصنیف میں سمائی ہے۔ مگر یہ سب کی سب اپنے ہی دائرے میں ہیں۔ اگرچہ بعض نے اُن میں سے بہت کچھ ترقی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ عربی فارسی کی آمیزش صرف اُردو ہی میں تو نہیں۔ ملک کی دوسری زبانیں بھی اُس سے فیض یاب ہیں، مثلاً بنگالی۔ بابو صاحب کی جس تحریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اُسی میں ایک مایۂ ناز بنگالی مصنف کی نسبت لکھا ہے: ’’اس شخص کی تحریر گویا ایک قسم کی پچیکاری ہے جس میں فارسی کو بنگالی کے ساتھ وصل کیا ہے۔‘‘ اس مؤلف کی تصانیف کو مضمون نگار نے بنگالی کے ’’ادبی جواہرات‘‘ میں شامل کیا ہے۔ ترقی یافتہ مرہٹی زبان میں پچیس فی صدی الفاظ فارسی کے ہیں۔ (رسالۂ اُردو اپریل ۱۹۲۱ء) گوشہ نشین زبان ’’کوکنی‘‘ میں بھی دس فی صدی ’’سامی‘‘ الفاظ (عربی فارسی) ہیں۔ (رسالۂ اُردو اکتوبر ۱۹۲۲ء)

نینی تال کے قریب سرد ہواؤں سے جب میدانی تپش سے جھلسے ہوئے مسافروں کے تن بدن میں

جان آتی ہے تو اُن کی آنکھیں ایک روح پرور چشمے سے ٹھنڈی ہوتی ہیں جو سنگ مرمر کے شفاف گئو مکھ سے گرتا ہے۔ اس چشمے پر سنسکرت کا یہ مقولہ لکھا جس کا ترجمہ اُردو میں بھی درج ہے "جو کوئی آدمی پانی کے چشمے کو نقصان پہنچاتا ہے وہ دوزخ میں داخل ہوتا ہے" کیا یہ رشیوں کا قول ہماری عبرت کے لئے کافی نہیں جو ادب کے سرچشمے کو جو پریم کا امرت پلاتا تھا، زہر آلود کرتے ہیں۔ کیا اس کا وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم محض ملک اور نیشن کی بہبودی کے لئے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ جو زبان رفتہ رفتہ ترقی کر کے ملک کی عام زبان بن چکی ہے، جدید علوم و فنون کی درس تدریس کی استعداد پیدا کر چکی ہے اُس کی سرپرستی کریں اور سب کے سب مل کر پھر اس بادۂ الفت سے سرشار نظر آئیں۔ ہمارے بچے بقول ایک ماہر تعلیمات کے سوتیلی ماں کا دودھ چھوڑ کر سگی ماں کے دودھ سے پرورش پائیں۔

اسی سلسلے میں یہ تجویز شاید بے جا نہ ہو کہ اس اجلاس شعبۂ اُردو کی یادگار میں پنجاب میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم ہو جو متفقہ کوشش سے پنجاب میں اُردو کی قدیم نشو و نما کی تحقیقات کرے اور پروفیسر شیرانی نے جس کام کا آغاز "پنجاب میں اُردو" لکھ کر کر دیا ہے اُس کو انجام تک پہونچائے۔

لطف و کرم کا مکرر سپاس مہر خاتمہ ہے۔
